قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر: عطاءُ الرحمٰن آرائیں

طابع: خالد منصور نسیم

مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۴۸۵۸۲۶

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۴ ——— ستمبر ۱۹۹۱ء ——— شمارہ ۹

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: ۱۰/- روپے

فہرست مضامین

۱۔ لمعات	ادارہ	۲
۲۔ ۶ ستمبر	قاسم نوری	۹
۳۔ بھولی ہوئی کہانیاں	ادارہ	۱۲
۴۔ یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے	اعزاز الدین احمد	۱۶
۵۔ دو قومی نظریہ	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۲۵
۶۔ سیکولر سٹیٹ	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۲۸
۷۔ ضیائے فکرِ قرآنی	ثریا عندلیب	۳۱
۸۔ سیاسی پارٹیاں اور اسلام	حنیف وجدانی	۳۴
۹۔ وحی صرف قرآن میں ہے	ازہر عباس	۴۷
۱۰۔ جدید ٹیکنالوجی اور علمِ باطن	محمد اسلم رانا	۶۳
۱۱۔ حقائق و عبر	ادارہ	۶۷
۱۲۔ بچوں کے لئے	قاسم نوری	۷۴
۱۳۔ اعلاناتِ درسِ قرآن	ادارہ	۷۸
۱۴۔ انتباہ	اے آر خان	۸۰

لمعات

(۱)

میاں نواز شریف ۔ وزیرِ اعظم پاکستان کی خدمت میں

محترم المقام!

ہمیں اس کا احساس ہے کہ آپ مملکت سے متعلق نہایت اہم امور کی سرانجام دہی میں مصروف ہیں اور بیحد مصروف. لیکن بایں ہمہ، ہم آپ کی توجہ چند ایسے امور کی طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں جن کے بگڑنے سے ہمارا سب کچھ بگڑ رہا ہے اور جن کے سنورنے سے ہمارا بہت کچھ سنور سکتا ہے. ہمیں امید ہے کہ آپ ہماری ان گذارشات کو درخورِ اعتنا تصور کریں گے۔

"حکومت کا وجود کیوں ضروری ہے. اس کے فرائض و واجبات کیا ہیں؟ اور ایک اچھی حکومت کسے کہتے ہیں"۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کے متعلق افلاطون کے زمانہ سے لے کر آجتک اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اسے یکجا کیا جائے تو ہمالیہ کے انبار لگ جائیں. لیکن اس تمام ذخیرے کو اگر سمیٹا جائے تو اس میں سے قدرِ مشترک یہ نکلے گی کہ حکومت کا وجود اس لئے ضروری ہے کہ افرادِ مملکت امن، آرام اور اطمینان کی زندگی بسر کریں۔ امن ہر قسم کے خطرات سے۔ آرام جسمانی ضروریات کے بآسانی اور بافراط میسر آجانے سے اور اطمینان، قلبی مسرتوں اور ذہنی خوشگواریوں کی رُو سے۔ بنابریں ایک اچھی حکومت وہ ہوگی جس میں ہر فرد کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت، غرضیکہ زندگی کی ہر متاعِ عزیز محفوظ رہے۔ جس میں ان کی ضروریاتِ زندگی جگر پاش مشقتوں کے بغیر پوری ہوتی رہیں. انھیں اپنے معاملات کے سلجھانے اور سنورنے میں کسی قسم کی پریشانی نہ اٹھانی پڑے اور ان کے دل و دماغ کی صلاحیتیں بطریقِ احسن نشوونما پاتی رہیں. یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں ہو سکتا. اچھی اور بُری، کامیاب اور ناکام حکومت کے پرکھنے کی یہ ایسی کسوٹی ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا.

سوال یہ ہے کہ اگر حکومتِ پاکستان کو اس کسوٹی پر پرکھا جائے تو ہم کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں؟ اگر اسے اس میزان میں تولا جائے تو اس کا کون سا پلڑا جھکتا ہے؟ اس مقصد کے لئے ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی چند ایک مثالیں پیش کریں تاکہ حقیقتِ حال بے نقاب ہو کر سامنے آجائے۔ تمہیداً اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ حقیقت سے پردہ اٹھانے کی یہ کوشش کسی تخریبی عنصر کی طرف سے نہیں ہو رہی۔ یہ صدائے دردناک ہے اس طلوعِ اسلام کی طرف سے جس کے نزدیک مملکتِ پاکستان کا وجود اور اس کا استحکام، جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ خطۂ زمین ہے جس میں طلوعِ اسلام کو توقع ہے کہ ہم اپنے تصورات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں گے یعنی اس میں قرآنی نظام متشکل ہو سکے گا اور قرآنی نظام کی تشکیل، طلوعِ اسلام کے نزدیک، ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اسے اسی نگاہ سے دیکھیں گے اور اسی نقطۂ نظر سے اس پر توجہ دیں گے۔

سب سے پہلے حفاظت کو لیجئے۔ کہتے ہیں کہ ڈاکو رات کی تاریکی میں آیا کرتے تھے۔ اپنے چہرے نقاب میں چھپائے رکھتے اور کسی دُور افتادہ تنہا آبادی پر چھاپہ مار کر فرار ہو جاتے۔

یہ بھی سُنا ہے کہ رہزن ایسے راستوں میں چھُپ کر بیٹھے رہتے جہاں لوگوں کی آمد و رفت کم ہوتی اور جب دوپہر یا شام کے وقت کوئی اکیلا دُکیلا مسافر اُدھر جا نکلتا تو اسے لُوٹ کر بھاگ جاتے۔

ٹھگوں کے متعلق بھی سننے میں آیا ہے کہ وہ مہینوں کسی کے ساتھ رہتے۔ اس پر اپنا پورا پورا اعتماد قائم کرتے اور جب وہ اس طرح اپنی حفاظت سے بے خبر ہو جاتا تو پھر اسے دھوکا دیتے۔

لیکن اب یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب تو ایک آدمی بھرے بازار میں سینکڑوں لوگوں کے سامنے کسی بنک، دکان یا گھر میں روزِ روشن میں داخل ہوتا ہے، کلاشنکوف کے دو ایک برسٹ مارتا ہے اور سب کچھ چھین کر اطمینان سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

بچے سکول جاتے ہیں تو انھیں راستے ہی سے اغوا کر لیا جاتا ہے۔ لڑکیاں کالج سے نکلتی ہیں تو ان کے راستے روک لئے جاتے ہیں۔ کسی بدنصیب کو موٹر میں ڈال کر بھگا لیا جاتا ہے۔ کوئی معصوم کئی دنوں کے بعد کسی فلیٹ سے برآمد کی جاتی ہے۔ کسی کے متعلق پتہ چلتا ہے کہ وہ فلاں مقام پر فروخت کر دی گئی۔ غرضیکہ کوئی صبح ایسی نہیں گذرتی کہ آپ اخبار اٹھائیں اور اس میں اس قسم کے قتل و غارت گری، قزاقی اور رہزنی، بردہ فروشی اور عصمت دری کے واقعات درج نہ ملیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہر شریف آدمی اپنے اپنے ہاں ڈرا اور سہما ہوا زندگی کے دن بسر کر رہا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے ساتھ کل کیا ہونے والا ہے۔

محترم المقام!

غور فرمائیے کہ جہاں زندگی اس شکل سے گذر رہی ہو وہاں لوگوں کی قلبی کیفیت کیا ہوگی؟ ہمیں معلوم ہے کہ

ان میں سے ہر جُرم کے لئے قانون موجود ہے۔ پولیس موجود ہے۔ عدالتیں موجود ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ روزمرہ کے واقعات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس مشینری میں کہیں کوئی سقم ہے ـــــ اور بہت بڑا سقم۔ اس کی وجہ سے بدمعاشوں کے دل سے قانون کا ڈر اور شریفوں کے دل سے اس کا اعتماد جاتا رہا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس سرزمین میں قانون کا ڈر اور اعتماد باقی نہ رہے وہ سرزمین بے آئین ہو جاتی ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ آپ ذاتی طور پر دیکھیں کہ وہ سقم کہاں ہے اور اُسے کیسے دُور کیا جا سکتا ہے۔

حفاظت سے نیچے اُتر کر، ضروریاتِ زندگی کی طرف آیئے تو وہاں حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ صحت اور زندگی کا مدار اشیائے خورونوش پر ہے۔ جس قسم کی یہ اشیاء ملیں گی اسی قسم کی صحت ہوگی اور جس قسم کی صحت ہوگی اسی نسبت سے قوم ترقی کرے گی۔

معاشرے کا بیشتر حصہ ایسا ہے جسے پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا اور جنھیں ملتا ہے انھیں بھی کوئی چیز خالص نہیں ملتی۔ جب قوم آٹے کی جگہ برادہ، مصالحے کی جگہ گھوڑے کی لید، دودھ کی جگہ جوہڑ کا پانی، مکھن کی جگہ ویزلین اور گھی کی جگہ وائٹ آئل کھائے گی تو جانے والی نسل کو تو چھوڑیئے کہ وہ کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن پورے کر لیگی، سوال آنے والی نسل کا ہے جس نے کل کو ملتِ پاکستانیہ بننا ہے۔ اگر آپ اس کا اندازہ کرنا چاہیں کہ اس غذا کا ہمارے بچوں پر کیا اثر پڑ رہا ہے تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی اسکول کے دروازے کے سامنے اس وقت کھڑے ہو جایئے جب بچوں کو چھٹی مل رہی ہو۔ آپ دیکھئے کہ کسی بچے کے چہرے پر تازگی اور کسی کے جسم میں خونِ صالح کا قطرہ دکھائی دیتا ہے؟ منحنی، زرد رو، کمزور بچے جو زندگی کی شگفتگی اور شادابی سے یکسر محروم ہیں۔ یہ ہیں ہماری آنے والی قوم کے بہترین نمونے، انہی سے ہمارے جیوش و عساکر مرتب ہونے ہیں اور انہی سے سول کی انتظامیہ متشکل۔ آپ سوچیئے کہ جو جسم اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں وہ قوم کی ذمہ داریوں کو کیسے اٹھا سکیں گے؟ یہ مسئلہ بڑی گہری توجہ کا مستحق ہے۔ اس لئے کہ جو قوم اپنے مستقبل پر نگاہ نہیں رکھتی، صفحۂ کائنات پر اسے ثبات و دوام نصیب نہیں ہو سکتا۔

ہمیں اس کا علم ہے کہ ان تمام امور کی دیکھ بھال کے لئے محکمے اور شعبے متعین ہیں اور ان محکموں کے پیچھے قانون کی قوت بھی موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو کچھ ہو رہا ہے اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ یہ تمام انتظامات اپنا صحیح نتیجہ کیوں نہیں مرتب کر رہے؟ اور یہی وہ سوال ہے جس کے حل کے لئے ہم نے آپ کو ذاتی طور پر مخاطب کرنے کی جسارت کی ہے۔

جسم کی ضروریات کے بعد، قوم کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کی نشوونما کا سوال آتا ہے۔ ان صلاحیتوں کی نشوونما تعلیم اور تربیت سے ہوتی ہے۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، قوم کے پچاس فیصد سے بھی زائد بچے ایسے ہوں گے

کسی اسکول (یا کالج) میں داخلہ ہی نہیں ملتا۔ جنھیں داخلہ ملتا ہے ان پر خرچ اتنا اٹھتا ہے کہ متوسط طبقہ کے لئے اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ نرسری کلاس میں (جہاں بچے محض کھیلنے کے لئے جاتے ہیں) ایک بچے کی فیس ۱۵۰ روپے ماہوار کے قریب ہوتی ہے۔ کتابوں، کاپیوں، متفرق اشیاء یونیفارم وغیرہ کا خرچ مستزاد ہے جب بچہ نرسری کلاس سے ذرا آگے بڑھے تو اسکول کی طرف سے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں کہ بچے کے لئے پرائیویٹ ٹیوشن کا انتظام کیا جائے۔ یہ ٹیوشن کسی صورت میں بھی ۱۰۰، ۲۰۰ روپے ماہوار سے کم نہیں ہوتی۔ یہ ابتدائی کلاسز کا حال ہے۔ اس سے اوپر چل کر خرچ کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے۔

اتنے اخراجات کے بعد، بچوں کو جس سطح کی تعلیم ملتی ہے، ان کے امتحانات کے نتائج اس کے آئینہ دار ہیں۔ کامیابی کی شرح ہر سال نیچے گرتی جا رہی ہے۔ جو طالب علم کامیاب ہو کر نکلتے ہیں۔ ان کی قابلیت کسی سے پوشیدہ نہیں۔

یہ تو رہا تعلیم کا معیار۔ جہاں تک اس کے نہج و اسلوب کا تعلق ہے، ہم آج بھی اسی دور میں پھر رہے ہیں جو انگریزوں کی غلامی کا تھا۔ نہ تعلیم کی بنیادی پالیسی میں کوئی فرق آیا ہے نہ نصاب میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی۔ اگر کہیں کوئی تبدیلی ہوئی ہے تو اس کے نتائج پہلے سے بھی بدتر ہیں۔ تعلیم میں نہ اسلامی اقدار کا کوئی لحاظ رکھا جا رہا ہے نہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کی کوئی رعایت، نہ مسلمانوں کے مخصوص تصورِ حیات کا کوئی خیال ہے نہ ان کے نظریاتِ زندگی کا کوئی تصور۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے نوجوان طبقہ کے ذہنوں میں انتشار، خیالات میں پراگندگی، افکار میں بے راہ روی، نگاہوں میں بے باکی اور قلوب میں سرکشی کے جذبات تیز سے تیز تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ قوم کی درسگاہیں، قوم کے بچوں کے صحیح تربیتی مراکز ہوتی ہیں۔ جن درسگاہوں کا یہ عالم ہو ان میں بچوں کی جس قسم کی تربیت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ ان کی تباہی و بربادی کے لئے یہی فتنہ کچھ کم نہ تھا کہ اس پر مغرب سے آنے والی مار دھاڑ سے لبریز فحش اور عریاں فلموں کے سیلاب کے سب بند کھول دیئے گئے ہیں۔ یہ ہے وہ قعرِ دریا جس میں ہم نے اپنے نوجوانوں کو تختہ بند کر رکھا ہے اور اس کے بعد ان سے کہا جاتا ہے کہ دامن تر مکن ہوشیار باش!

جس قوم کے نوجوانوں کی تعلیم اور تربیت کا یہ عالم ہو، اس کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرنے کے لئے "الہام" کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ یہ چیز ہر نوجوان کی پیشانی پر لکھی جائے گی۔ بس اس کے پڑھنے کے لئے بصارت کے بجائے بصیرت کی ضرورت ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ تعلیم کے سلسلہ میں حکومت کی طرف سے کافی روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ اس کی انتظامی مشینری ہر وقت متحرک دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے باوجود، جو نتائج ہیں، وہ سب کے سامنے ہیں۔

یہ ہے، ہمارے محترم! افرادِ مملکت پاکستان کے امن، چین اور اطمینان کی حالت۔ جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس میں نہ کوئی نئی بات ہے نہ غیر معمولی واقعہ۔ یہ وہ واقعات ہیں جو ہر روز ہماری آنکھوں کے سامنے رُونما ہوتے رہتے ہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس صورتِ حال کو اطمینان بخش کہا جاسکتا ہے؟ اور اگر اسے اطمینان بخش نہیں کہا جاسکتا تو کیا ان واقعات کی اہمیت اور نزاکت اس کی متقاضی نہیں کہ ان کی طرف فوراً توجہ مبذول کی جائے؟ ہمارا خیال ہے کہ حالات کی نزاکت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ آپ کی ذاتی اور خصوصی توجہ کے بغیر انکی اصلاح کی کوئی صورت نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ بے حد مصروف ہیں اور اس کا بھی ہمیں احساس ہے کہ جن امور میں آپ مصروف ہیں وہ بڑے اہم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، ہمارا خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ جن حالات کی طرف ہم نے توجہ مبذول کرائی ہے وہ ان سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ اگر ان کی طرف فوری توجہ نہ دی گئی تو ہمیں ڈر ہے کہ کہیں آپ از سرگزشت کی کیفیت نہ پیدا ہوجائے اور اس کے بعد جن اہم امور کی سرانجام دہی میں آپ اس وقت مصروف ہیں ان میں آپ کی کامیابی، (خدانخواستہ) امریکہ کے اس مشہور سرجن کی کامیابی کی مثال نہ بن جائے جس نے ایک بڑے معرکہ کے اپریشن کے بعد، دنیائے طب میں یہ خبر نشر کی کہ اپریشن بڑا کامیاب رہا ہے۔ صرف اتنا ہوا کہ مریض نہ بچ سکا۔

کیا ہم توقع کریں کہ آپ ان گذارشات کو مستحقِ توجہ خیال فرمائیں گے؟ ہمیں یقین ہے کہ اگر آپ نے اُن کی طرف کماحقہ، توجہ دی تو حالات بہت جلد سدھر جائیں گے۔ اس لئے کہ فطرت کی طرف سے آپ کو جس قدر کام کرنے کی صلاحیت اور توانائی عطا ہوئی ہے اس کے پیشِ نظر یہ مرحلہ آپ کے لئے کچھ ایسا دشوار گذار نہیں۔ ضرورت ہے دیانتِ مقصد کے ساتھ اس مسئلہ کو ہاتھ میں لینے کی۔ اس کے لئے ضرورت ہے عزم راسخ اور ہمت بلند کی۔ ضرورت ہے جرأت اور بے باکی کی۔ ضرورت ہے آنکھوں پر پٹی باندھ کر ترازوئے عدل کو ہاتھ میں لینے کی اور ضرورت ہے چھوٹے اور بڑے اور غریب اور امیر کا امتیاز کئے بغیر بطشِ شدید اور گرفتِ محکم کی۔ اس سے ایسی فضا پیدا ہو سکتی ہے جس میں قانون شکنی کا ارادہ کرنے والے کا تنہائی میں بھی خوف سے دل کانپ اُٹھے اور پُرامن شریف انسان اطمینان کی نیند سو سکیں۔ جو حکومت ایسی فضا پیدا کردے وہی کامیاب اور قابلِ فخر حکومت کہلا سکتی ہے اگر آپ نے ایسی فضا پیدا کردی تو یقین مانئے کہ کروڑوں دلوں کا اطمینان، جریدۂ عالم پر آپ کا دوام ثبت کردیگا۔

(۲)

پنشنروں کی حالتِ زار

حکومت نے حسبِ سابق اپنے ملازمین کی تنخواہوں میں اس سال بھی کچھ نہ کچھ اضافہ کردیا ہے لیکن پنشنوں

...ے کی نوٹیفکیشن تادمِ تحریر نظر سے نہیں گزری۔ غریب پنشنروں کی حالتِ زار پر ہم پہلے بھی روشنی ڈال ...ہے۔ امسال بھی حکومت سے درخواست ہے کہ اس معاملے کو التوا میں نہ ڈالیے کہ عمر رسیدہ پنشنروں کو دال ...کے علاوہ دوا بھی چاہیئے۔

ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ ایک شخص پچیس تیس سال کی مسلسل محنت کے بعد ملازمت کے آخری زینہ تک جا پہنچا ہے، اس کا اور اس کے متعلقین کا معیارِ زیست اس نسبت سے بلند ہو چکا ہے۔ زندگی کی آسائشیں میسر ہیں۔ رہنے کو سرکاری مکان (بعض اوقات بلا کرایہ اور دیگر حالات میں محض برائے نام کرایہ پر) موجود ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے سرکاری انتظامات ہیں۔ طبی امداد مفت حاصل ہے کہ اس کی ریٹائرمنٹ کا حکمنامہ موصول ہو جاتا ہے جو اس کی حسنِ کارکردگی کی سند ہوتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس سے وہ ساری آسائشیں چھن جاتی ہیں۔ مکان سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ الاؤنسز وغیرہ ختم ہو جاتے ہیں اور سب سے بڑی چیز یہ کہ تنخواہ بھی نصف (اور بعض حالات میں اس سے بھی کم) رہ جاتی ہے۔ آپ سوچئے کہ عین اس وقت، جب اُسے (عمر کے آخری حصہ میں) زیادہ آسائشوں کی ضرورت تھی۔ اس کا اس طرح "کھجور سے نیچے آگرنا" کس قدر استخوان شکنی کا موجب ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کی اس حالت کا نقشہ بڑے عبرت انگیز انداز سے کھینچا ہے۔ جب فرمایا کہ:۔

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَن تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ (۲/۲۶۶)۔

(ذرا سوچو کہ) ایک شخص ہے جس کے پاس کھجوروں اور انگوروں پر مشتمل (لہلہاتا) باغ ہے۔ اس میں (سیرابی و شادابی کے لئے) نہریں بہہ رہی ہیں۔ اس میں ہر قسم کے پھل پھول پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بوڑھا ہو جاتا ہے اور چھوٹی چھوٹی اولاد اس کے گرد جمع ہوتی ہے کہ اتنے میں ایک جھلستی ہوئی آندھی چلتی ہے اور آن کی آن میں وہ باغ جل کر ویران ہو جاتا ہے کیا تم میں سے کوئی بھی چاہے گا کہ اس کا یہ حشر ہو جائے۔ اللہ ایسی ہی مثالوں کے پیرایہ میں تم پر حقیقت کی نشانیاں واضح کر دیتا ہے تاکہ تم غور و فکر سے کام لو۔

ایسا کون چاہے گا؟ لیکن وہ چاہے یا نہ چاہے، پنشنر کو یہ باغ چھوڑ کر اپنے بال بچوں کے ساتھ ویرانے میں بسنا پڑتا ہے۔ پھر طرفہ تماشا یہ کہ جب اسے پنشن ملی تھی تو اس وقت روپے کا بیس سیر آٹا ملتا تھا۔ اب چار روپے

سیر ملتا ہے۔ بڑھاپا بڑھتا جاتا ہے، قویٰ کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ آسائشوں کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اور اس کی آمدنی (ہوشربا گرانی کی وجہ سے) دن بدن سکڑتی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی پنشن والوں کی تو فاقوں تک نوبت آجاتی ہے اور یہی وہ طبقہ ہے جو فوری توجہ کا محتاج ہے۔ ان بے چاروں کی عام طور پر حالت کیا ہوتی ہے۔ اس کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو کسی مہینے کی پہلی تاریخ کو خزانے کے دفتر کے سامنے جایئے اور دیکھئے کہ یہ سسکتی ہڈیاں آپ کو کیا کیا یاد دلاتی ہیں۔

اس صورتِ حال کی بنیادی ذمہ دار وہ ذہنیت ہے جس کے مطابق انگریز نے سرکاری ملازمین کی تنخواہ ان کی ضروریات کے مطابق نہیں، بلکہ اپنے پیمانوں کے مطابق مقرر کی۔ اس تنخواہ میں کسی کا گذارہ ہوتا ہے یا نہیں اس سے اس کا کچھ واسطہ نہیں تھا اور جب ملازمت کے دوران اس سے اس کا کچھ واسطہ نہیں تھا تو ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد (پنشنر کے لئے) وہ اس سے واسطہ کیوں رکھتا؟ اس کا حقیقی حل وہی ہے جو قرآنِ کریم نے تجویز کیا ہے۔ یعنی یہ نظامِ معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر فرد کو اس کی ضمانت دے کہ:

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا۔ ہم اربابِ حکومت سے پُرزور گذارش کریں گے کہ وہ اس بظاہر سفید پوش لیکن درحقیقت عریاں بدن طبقہ کی حالت بہتر بنانے کے لئے بلا تاخیر ضروری اقدامات کریں تاکہ یہ ناسازگار حالات کے ستائے ہوئے، اپنی زندگی کے آخری دن قدرے پُرسکون گزار سکیں۔

پنشن کی رقم چونکہ حاضر ملازمین کی تنخواہ کے نصف سے بھی کم ہوتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ پنشنوں میں اضافہ کرتے وقت اضافے کی شرح حاضر ملازمین سے کم از کم دوگنا رکھی جائے تاکہ ان غریبوں کے دکھوں کا مداوا نہیں تو کم از کم اشک شوئی تو ہو سکے۔

سچے موتی

حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری ضرورت سے زائد ہو وہ اس آدمی کو دیدے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِ راہ زیادہ ہو وہ اسے دیدے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اسی طرح آپؐ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔ (مسلم)

قاسم نوری

۶۔ ستمبر

ہماری زندگی اور بقا کی پہلی صبح

فرد ہو یا کوئی قوم ــــ ہر ایک کی زندگی میں نہ کوئی نہ کوئی لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جو اس کی عظمت و شوکت کا یادگار موڑ ثابت ہوتا ہے، اس کی شناخت اور حوالہ بن جاتا ہے اور وقت اپنے دامن میں اس لمحہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیتا ہے ــــ ایسے ہی انمول لمحوں کو حروف اور لفظ بنا کر وقت نے پاکستانی قوم کی داستان تحریر کی اور اس کا عنوان رکھا ــــ ۶۔ ستمبر۔

۶ ستمبر کے حوالے سے کچھ کہا جائے تو بات صرف اتنی نظر آئے گی کہ ہمارے پڑوسی ملک بھارت نے جو ہم سے آبادی کے لحاظ سے دس گنا بڑا ملک ہے اور طاقت کے اعتبار سے چھ گنا زیادہ ہے۔ آج سے پچیس سال پہلے یعنی ۱۹۶۵ء میں کسی وجہ کے بغیر صرف طاقت کے نشے میں پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ چند گھنٹے کے اندر اندر ہمارا سارا ملک تہہ و بالا کر دے گا اور اس پر قابض ہو جائے گا لیکن سترہ دن کی ہولناک جنگ کے باوجود وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ ہزاروں لوگ مارے گئے اور سینکڑوں فوجی گرفتار ہو گئے ــــ بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری بھاگے بھاگے خود ماسکو گئے اور روس کی خوشامد کی کہ وہ پاکستان کو روکے ورنہ ہم بھارتی تباہ ہو جائیں گے ــــ دوسری طرف ہماری فوج اور عوام کے حوصلے اس قدر بڑھے ہوئے اور مضبوط تھے کہ پاکستان کے وزیر خارجہ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ میں اعلان کیا کہ ہمیں اگر ایک ہزار سال تک بھی لڑنا پڑا تو اپنی آزادی اور بقا کے لئے ہم لڑیں گے ــــ اور پھر ساری دنیا کے مجبور کر دینے پر جب روس کے ایک شہر تاشقند میں صلح اور سمجھوتے کے لئے ہمارے ملک کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری آمنے سامنے بیٹھے تو دستخطوں کے بعد ندامت اور شرمندگی کی وجہ سے وہیں بھارت کے وزیر اعظم کا ہارٹ فیل ہو گیا اور اس

طرح ہم اپنا وطن، اپنی آزادی اور اپنا مستقبل بچانے میں کامیاب ہو گئے اور پانچ چھ گنا بڑی طاقت بھی ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

لیکن یہ تو صرف تاریخی روئیداد ہے۔ اس کامیابی میں پوشیدہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ایک دھاگے کو توڑنا آسان ہوتا ہے لیکن بہت سے دھاگے ملا دیئے جائیں تو انھیں کوئی پہلوان بھی نہیں توڑ سکتا — قطرہ کو مٹانا آسان ہوتا ہے — قطرے اکٹھے ہو جائیں تو سمندر بن جاتے ہیں اور سمندر کو زیر نہیں کیا جا سکتا۔ — ذرے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیں تو چٹان بن جاتے ہیں اور چٹانوں کے سر کوئی طاقت کبھی نہیں جھکا سکتی۔ اسی طرح پاکستان کی پوری قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی تھی۔ اس طرح متحد ہو گئی تھی کہ آسمان نے اس کی مثال کم کم دیکھی ہوگی — مذہب، زبان، نسل اور علاقوں کا کوئی فرق، کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا — ساری قوم کا دل ایک ہو گیا تھا، ایک ساتھ دھڑک رہا تھا — پوری انسانی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ زمانۂ جنگ میں ضرورتِ اشیاء کی قیمتیں بڑھنے کے بجائے موجود سطح سے بھی کم ہو جائیں۔ قوم، موت سے ڈرنے کے بجائے، گھروں سے باہر نکل آئے، نہتی نکل آئے اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو جائے — زخمیوں کے لئے ہسپتالوں کے باہر خون دینے والوں کی قطاریں لگ جائیں اور حکومت کو بار بار اعلان کرنا پڑے کہ خون کی ضرورت نہیں ہے — سٹور کرنے کے لئے فریزرز، ہسپتالوں میں نہیں ہیں تو خون دینے والے اپنے گھروں سے فریج اور فریزرز لے کر نکل کھڑے ہوں — جدھر جدھر سے فوجی قافلے گزریں، لوگ گھروں سے کھانے اور پھل اُٹھا اُٹھا کر انھیں زبردستی پیش کریں — گلیوں، چوکوں اور چوراہوں پر امدادی سامان کے مینار لگ جائیں اور ہر شخص سراپا ایثار بن جائے — بچہ بچہ یہ چاہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ اپنے گھر اپنے پیارے وطن پاکستان کی بقاء اور تحفظ کی نذر کر دے۔ یہ جذباتی اور عقیدت و محبت کی خود ساختہ کہانیاں نہیں ہیں بلکہ تاریخ کی وہ روشن حقیقی مثالیں ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے سوچ اور عمل کا رُخ متعین کرتی ہیں — جو ہمیں بتاتی ہیں کہ عزت و آبرو کے ساتھ جینے کے لئے اپنے اندر پوشیدہ صلاحیتوں سے باخبر ہونا، انہیں تسخیر کرنا اور کام میں لانا کس قدر ضروری ہوتا ہے اور یہ صلاحیتیں اور پوشیدہ طاقتیں، ابتلاء و آزمائش کے کٹھن وقت میں اُبھر کر سامنے آتی ہیں — ۶ ستمبر جو پاکستان کی تاریخ کا ناقابلِ فراموش باب ہے، ہمیں بتاتا ہے کہ اتحاد کی قوت سب سے بڑی قوت ہے۔

اور

فرد قائم — ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں — اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

لیکن اتحاد کی یہ قوت آتی کہاں سے ہے؟ وہ جذبۂ محرکہ کون سا ہے جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب

...ن کو جوڑ کر آہنی دیوار بنا دیتا ہے ـــــ وہ جذبۂ محرکہ ہے ایمان ـــــ اللہ، اس کے رسول اور قرآنِ کریم پر ایمان ـــــ یہی جذبۂ محرکہ "بدر وحنین" میں کفار کی اکثریت پر غالب آیا تھا۔ اسی جذبہ نے برطانیہ جیسی عظیم قوت کو پاش پاش کیا تھا اور اسی جذبہ نے تیس کروڑ ہندوؤں کی غلامی سے مسلمانانِ ہند کو نجات دلائی تھی ... دنیا کے نقشے پر ایک نئی حکومت اور نئے ملک کا نام اُبھر آیا تھا ـــــ پاکستان۔

اور پاکستان کا مطلب تھا ـــــ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

اور جب تک یہ جذبۂ محرکہ زندہ ہے ـــــ ہم زندہ رہیں گے ـــــ ہماری قوم زندہ رہے گی اور ہمارا ملک پاکستان زندہ و پائندہ رہے گا ـــــ

خُدا پر ایمان

دنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں ملتا ہے ـــــ لیکن اس کے باوجود

قرآن، اِن کے اس ایمان کو صحیح تسلیم نہیں کرتا

یہ اس لئے کہ ان کے ہاں ـــــ خدا کا صحیح تصور نہیں

خُدا کا صحیح تصوّر

خود خدا کے ہاں سے مل سکتا ہے، یعنی قرآن مجید سے، خدا کا یہی وہ تصور ہے جسے **پرویز** صاحب نے اپنی معرکہ آراء کتاب

من و یزداں

میں نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے نیز یہ بھی بتایا ہے کہ

ہم خدا پر کیوں ایمان لاتے ہیں ـ اور ـ انسان اور خدا کا تعلق کیا ہے۔

بڑی پُر از حقائق کتاب ہے۔

بھولی ہوئی کہانیاں

ایک دن عمر بن عبدالعزیزؒ مسندِ خلافت پر متمکن تھے، ایک عیسائی نے جو حمص کا رہنے والا تھا دربار میں آکر یہ شکایت کی کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے بیٹے عباس نے میری زمین پر زبردستی قبضہ کرلیا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز نے عباس کی طرف دیکھا۔ عباس نے کہا۔ "یہ زمین مجھ کو خلیفہ ولید نے بطور جاگیر کے عنایت کی تھی چنانچہ اس کی تحریری سند میرے پاس موجود ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے عیسائی کی طرف مخاطب ہوکر کہا۔ تم کیا جواب دیتے ہو۔ اس نے کہا، امیرالمومنین! میں خدا کی تحریر (قرآنِ مجید) کے مطابق فیصلہ چاہتا ہوں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے عباس کی طرف مخاطب ہوکر کہا۔ عباس، خدا کی تحریر تیرے باپ (ولید بن عبدالملک) کی تحریر پر مقدم ہے۔ یہ کہہ کر وہ زمین عباس کے قبضے سے نکال کر عیسائی کو دلادی۔

ان کا ایک اور کارنامہ جو نہایت قابلِ قدر ہے۔ سلاطینِ بنی اُمیہ کی ناجائز کارروائیوں کو مٹانا تھا۔ سلاطین بنی امیہ نے ملک کا بڑا حصہ جو زمینداری کی حیثیت سے رعایا کے قبضے میں تھا اپنے خاندان کے ممبروں کو جاگیر میں دے دیا تھا۔ جس طرح سلاطین تیموریہ کے زمانے میں بڑے بڑے صوبے شہزادوں کی جاگیر میں دیدیئے جاتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ تختِ خلافت پر بیٹھے تو سب سے پہلے ان کو اس کا خیال ہوا لیکن ایسا کرنا تمام خاندانِ خلافت کو دشمن بنالینا تھا تاہم انھوں نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔

اوّل اوّل جب انھوں نے یہ ارادہ کیا تو تمام خاندان نے اُمِ عمر کو جو عمر بن عبدالعزیزؒ کی پھوپھی تھیں سفیر مقرر کرکے بھیجا انھوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس جاکر کہا کہ تمام خاندان برہم ہے اور مجھ کو ڈر ہے کہ عام بغاوت نہ ہوجائے اور لوگ ہنگامہ نہ کردیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا، میں قیامت کے سوا اور کسی دن سے نہیں ڈرتا۔ وہ مایوس ہوکر چلی گئیں۔

خود عمر بن عبدالعزیزؒ کے قبضے میں اس قسم کی جاگیریں تھیں جو ان کے خاندان کو بنی امیہ کی طرف سے عنایت ہوئی تھیں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب ان جاگیروں کا فیصلہ کرنا چاہا، تو بڑے بڑے علماء یعنی مکحول، میمون بن مہران اور

بوقلابہ کو بلایا اور کہا کہ ان جاگیروں کی نسبت آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ مکحول نے دب کر جواب دیا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے میمون کی طرف رُخ کیا کہ تم خدا لگتی کہو۔ انھوں نے کہا کہ اپنے صاحبزادے عبدالملک کو بُلا لیجئے۔ وہ آئے تو عمر بن عبدالعزیز نے کہا، کیوں عبدالملک! اس معاملہ میں تمہاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا، سب کو واپس دینی چاہئیں ورنہ آپ کا شمار بھی انہی ظالموں اور غاصبوں میں ہوگا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے غلام سے، جن کا نام مزاحم تھا اور جن کو وہ مانتے تھے، کہا کہ لوگوں نے جو زمینیں ہم کو دیں، نہ وہ اس کے دینے کے مجاز تھے نہ ہم کو ان کے لینے کا حق تھا۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ مزاحم نے کہا امیرالمومنین! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کے بال بچے کتنے ہیں یعنی ان کا گذر کیونکر ہوگا؟ عمر بن عبدالعزیزؒ کے آنسو نکل آئے اور کہا، ان کا خدا مالک ہے ــــ یہ کہہ کر گھر میں چلے گئے۔ مزاحم وہاں سے اُٹھ کر عبدالملک (فرزند عمر بن عبدالعزیز) کے پاس گئے اور کہا، بڑا غضب ہوا چاہتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز تمام جاگیروں سے دست بردار ہو جانا چاہتے ہیں لیکن میں نے ان سے کہا کہ اپنی اولاد کا لحاظ کر لیجئے۔ عبدالملک نے کہا استغفر اللہ تم نے بہت بُری رائے دی۔ یہ کہہ کر عبدالملک عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس گئے۔ وہ اس وقت خوابِ راحت میں تھے۔ پہرے والے نے کہا کہ تم لوگ امیرالمومنین پر رحم نہیں کرتے دن بھر میں ایک لمحہ تو ان کو آرام لینے دو۔ عبدالملک نے کہا تیری ماں مرے، تو ان سے جا کر کہہ تو سہی عمر بن عبدالعزیزؒ کے کانوں میں یہ آواز پڑی، عبدالملک کو اندر بلا لیا اور کہا۔ جانِ پدر! یہ کون سا ملاقات کا وقت ہے؟ انھوں نے واقعہ بیان کیا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا، میں نمازِ ظہر کے بعد منبر پر چڑھ کر اس کا اعلان کر دوں گا۔ عبدالملک نے کہا، اس کا کون ذمہ دار ہے کہ آپ اس وقت تک زندہ رہیں گے۔ غرض اسی وقت عمر بن عبدالعزیزؒ باہر آئے۔ شہر میں منادی کرا دی گئی کہ لوگ مسجد میں جمع ہوں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے منبر پر چڑھ کر کہا۔ صاحبو! میں ان تمام زمینوں کو جو لوگوں نے ہمارے خاندان کو دی تھیں واپس کرتا ہوں، کیونکہ دینے والوں کو نہ دینے کا حق تھا نہ ہم کو لینے کا۔ یہ کہہ کر جاگیرات کی جو سندیں تھیں صندوق سے نکلوائیں اور قینچی سے کتر کتر کر ان کو پھینکنا شروع کیا ــــ یہ جاگیریں کچھ یمن میں تھیں جن کا نام مکیدس، جبل اور ورس تھا۔ کچھ یمامہ میں تھیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ان زمینوں سے دست برداری ظاہر کی۔

بنوامیہ نے یہ غضب کیا تھا کہ باغِ فدک کو جس کو حضرت فاطمہ زہراؓ کے تقاضے پر بھی حضرت ابوبکرؓ نے اس بنا پر نہیں دیا کہ وہ مسلمانوں کا حق ہے، اپنا خالصہ بنا لیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو خاندانِ رسالت میں منتقل کر دیا ــــ خاندانِ بنوامیہ میں ان کارروائیوں سے سخت برہمی پیدا ہوئی۔ سب نے متفق ہو کر ہشام بن عبدالملک کو عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس بھیجا کہ اس فیصلہ پر نظرِ ثانی کریں اور قدما جو فیصلہ کر گئے اس کو بحال رکھیں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا کہ اگر میرے سامنے ایک فرمان امیر معاویہؓ کا پیش کیا جائے اور ایک عبدالملک کا تو مجھ کو کس پر عمل کرنا چاہیئے؟ ہشام نے کہا، جو مقدم

ہو۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا تو خدا کا فرمان (قرآن) سب پر مقدم ہے۔

عمر بن عبدالعزیز کو تمام خاندان میں ابن سلیمان سے بہت محبت تھی وہ اپنی جاگیر کی سند لے کر آئے کہ میری زمین آپ کیوں چھینتے ہیں؟ فرمایا کہ پہلے یہ زمین کس کے قبضے میں تھی؟ بولے کہ حجاج کے۔ فرمایا، تو یہ حجاج کی اولاد کا حق ہے۔ تم کون ہوتے ہو؟ ابن سلیمان نے کہا، اصل میں یہ زمین عام مسلمانوں کی تھی۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا تو عام مسلمانوں کو ملنی چاہیئے۔ ابن سلیمان رونے لگے۔ مزاحم نے کہا، امیر المومنین! آپ ابن سلیمان کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہیں۔ فرمایا ہاں میں ابن سلیمان کو اپنے بیٹے کے برابر چاہتا ہوں، لیکن میں خود اپنے نفس کے ساتھ یہی برتاؤ کرتا ہوں۔

بنو امیہ کے دفترِ اعمال میں سب سے زیادہ قوم کا برباد کرنے والا یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے آزادی اور حق گوئی کا استیصال کر دیا تھا۔ عبدالملک نے تخت پر بیٹھ کر حکم دیا تھا کہ کوئی شخص میری بات پر روک ٹوک نہ کرنے پائے اور جو شخص ایسا کریگا سزا پائے گا۔ اگرچہ اس پر بھی آزادی پسند عرب کی زبانیں بند نہ ہوئیں تاہم بہت کچھ فرق آگیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس بدعت کو بالکل مٹا دیا ـــــ دو نہایت متدین اور راستباز شخص اس کام پر مقرر کیے کہ عدالت کے وقت ان کے پاس موجود رہیں اور ان سے جو غلطی سرزد ہو، فوراً ٹوک دیں۔ ان کے اس طرزِ عمل سے لوگوں کو عام طور پر جرأت ہو گئی تھی اور لوگ نہایت بے باکی سے ان کے افعال و اقوال پر نکتہ چینی کرتے تھے۔

آجکل مذہبی جوش اور مذہبی عصبیت کی یہ علامت خیال کی جاتی ہے کہ غیر مذہب کے لوگوں سے نفرت ظاہر کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو، ان کی تحقیر اور تذلیل کی جائے۔ یہاں تک کہ اکثر فقہی کتابوں میں لکھا ہے کہ عیسائیوں کو گھوڑے کی سواری کی اجازت نہ دینی چاہیئے۔

لیکن لوگوں کو حیرت ہوگی کہ عمر بن عبدالعزیزؒ جو ہمہ تن مذہب تھے ان کا طرزِ عمل ان کے خلاف تھا۔ محدث ابن جوزی نے اسی کتاب میں بہ سند یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ مسلمہ بن عبدالملک جو خاندانِ بنی امیہ کا دست و بازو تھا، اس نے ایک گرجا کے متولیوں کے مقابلے میں دعویٰ دائر کیا۔ فریقِ مقدمہ جو عیسائی تھے اجلاس میں حسبِ قاعدہ کھڑے تھے لیکن مسلمہ کو چونکہ خاندانی زعم تھا اس لئے بیٹھ کر گفتگو کرتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا، تمہارا فریقِ مقدمہ کھڑا ہے، اس لئے تم بیٹھ نہیں سکتے۔ تم بھی اس کے برابر برابر کھڑے ہو جاؤ یا کسی اور کو مقرر کرو جو تمہاری طرف سے مقدمہ کی پیروی کرے۔ مقدمہ کا فیصلہ بھی مسلمہ کے خلاف کیا، یعنی زمین متنازعہ گرجا کے متولیوں کو دلادی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ اکثر عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں مہمان ہوتے تھے لیکن ان کے کھانے کی قیمت دے دیا کرتے تھے۔ وفات کے وقت اپنے مقبرہ کے لئے جو زمین پسند کی وہ ایک عیسائی کی تھی اس کو بلا کر خریدنا چاہا۔ اس نے کہا امیر المومنین! قیمت کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لئے تو یہ امر برکت کا باعث ہوگا لیکن انھوں نے نہ مانا اور تیس دینار دے کر وہ زمین خرید کی۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کی حکومت و سلطنت کا اصلی اصول مساوات اور جمہوریت تھی، یعنی یہ کہ تمام لوگ یکساں حقوق رکھتے

...ت : کو کسی پر کسی قسم کی ترجیح حاصل نہیں. صرف ملکی امور میں نہیں بلکہ معاشرت اور ذاتی زندگی میں بھی وہ اس ... تے تھے. ان کے کھانے کا یہ طریقہ تھا کہ عام مسلمانوں کے لیئے جو لنگر خانہ تھا اس میں ایک درہم (۵) روز بھیجدیا کرتے تھے اور وہیں جاکر عام مسلمانوں کے ساتھ کھا لیتے تھے۔

ایک دفعہ رات کے وقت مسجد میں گئے، ایک شخص مسجد کے صحن میں لیٹا ہوا تھا. اتفاق سے عمر بن عبد العزیز کے پاؤں کی ٹھوکر اس کو لگی، اس نے جھلاّ کر کہا، کیا تو پاگل ہے؟ عمر ابن عبد العزیزؒ نے کہا کہ "نہیں". پولیس کے آدمی موجود تھے انھوں نے اس گستاخی کی سزا دینی چاہی. عمر ابن عبد العزیز نے کہا، کیوں، اس نے کیا گناہ کیا ہے. اس نے تو صرف استفسار کیا تھا کہ کیا تم پاگل ہو؟ میں نے کہہ دیا "نہیں".

عمر بن عبد العزیز کے صاحبزادوں میں سے عبد الملک بالکل اپنے باپ کا نمونہ تھے اور اس بنا پر یہ ان سے نہایت محبت رکھتے تھے. ایک دن عمر بن عبد العزیز نے میمون بن مہران کو بلاکر کہا کہ میں عبد الملک کو بہت اچھا سمجھتا ہوں. لیکن غالباً یہ مہر پدری کا اثر ہے. ذرا تم جاکر آزماؤ. تمہاری کیا رائے قائم ہوتی ہے. وہ عبد الملک کے پاس گئے. باتیں ہو رہی تھیں کہ عبد الملک کے غلام نے آکر کہا کہ میں نے انتظام کر دیا. میمون نے پوچھا، کیا؟ عبد الملک نے کہا کہ میں نے اس کو حکم دیا تھا کہ حمام میرے نہانے کے لیئے خالی کرادو. میمون نے کہا، اللہ اکبر! میرا خیال تمہاری نسبت بہت اچھا تھا لیکن اب میرے خیال میں فرق آگیا. تم کو اس کا کیا حق حاصل ہے کہ حمام کو اپنے لیئے خاص کر لو اور عام لوگوں کو نہانے سے روک دو. عبد الملک نے کہا میں نے تمام دن کا کرایہ ادا کر دیا ہے. میمون نے کہا تو یہ مشیخت پناہی اور فضول خرچی ہے. تم عام مسلمانوں کے برابر ہو. انھوں نے کہا، کیا کروں، لوگ حمام میں ننگے نہاتے ہیں. اس لیئے میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا. میمون نے کہا تو رات کو نہایا کرو. عبد الملک نے کہا آئندہ ایسا ہی کروں گا۔

عمر بن عبد العزیزؒ جب مرنے لگے تو مسلمہ بن عبد الملک نے کہا کہ وصیت کر جایئے. کہا، میرے پاس کیا ہے جس کی وصیت کروں. مسلمہ نے کہا، میں ابھی لاکھ روپے بھیج دیتا ہوں، جس کو چاہیئے اس میں سے وصیت کیجئے. فرمایا کہ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ یہ رقم جن لوگوں سے وصول کی ہے، ان کو واپس دے دو. مسلمہ یہ سن کر بے اختیار رو پڑے۔

اس سلسلہ میں یہ امر بیان کرنے کے قابل ہے کہ خلفائے بنو امیہ کی دولت مندی کا یہ حال تھا کہ جب ہشام بن عبد الملک نے وفات پائی تو اس کے ترکہ میں سے صرف اولاد ذکور کو جس قدر نقدی رقم وراثت میں ملی. اس کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ تھی، لیکن عمر بن عبد العزیزؒ نے جب وفات پائی تو کل سترہ دینار چھوڑے جس میں سے تجہیز و تکفین کے مصارف ادا کرنے کے بعد دس دینار بچے، جو ورثہ پر تقسیم ہوئے. غرض عمر بن عبد العزیزؒ کی خلافت اور سلطنت ٹھیک اسی اصول کا نمونہ تھی جو اسلام نے قائم کیا تھا اور جس کو سلاطین بنی امیہ و عباسیہ میں تلاش کرنا بالکل بے فائدہ ہے. یہ لوگ درحقیقت خلیفہ نہ تھے بلکہ کسریٰ و قیصر تھے۔

(طلوع اسلام جون ۱۹۵۴ء سے ماخوذ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعزاز الدین احمد خاں
لاہور چھاؤنی

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے

قوموں کے شجرِ حیات کی اصل (جڑ) ان کا یقین ہے ــــ اپنے نظریاتِ حیات پر یقین

تمہید

جس معاشرہ کے افراد کی یہ حالت ہو جائے کہ انہیں نہ کسی اصولِ زندگی پر یقین رہے اور نہ ہی ضابطۂ حیات پر ایمان۔ وہ زبان سے جس روش پر عقیدہ ظاہر کرتے ہوں دل سے اس کی صداقت کے قائل نہ ہوں۔ وہ کہتے کچھ ہوں اور چاہتے کچھ اور۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرے کے افراد اسی طرح بے یقینی کے جزام میں مبتلا ہو جائیں ان سے صحت مندانہ اقدام کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ قوموں کے شجرِ حیات کی اصل (جڑ) ان کا یقین ہے اپنے نظریۂ حیات پر محکم یقین اور اپنے تصورِ زندگی پر غیر متزلزل ایمان۔ بقول علامہ اقبالؒ ع

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے

اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالئے اور سوچئے کہ کہیں یہ ہمارے معاشرے کی بات تو نہیں ہو رہی! یہ کہانی، ہماری کہانی تو نہیں؟ ملتِ پاکستانیہ کی کہانی! ؎

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

ہمارا معاشرہ جس تیزی سے بے لگام ہوا ہے اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ الہ دین کے افسانے کا جن، اس طرح بوتل سے باہر نکل آیا ہے کہ اسے پھر سے بوتل میں بند کرنا خود الہ دین کے بس میں نہ رہا ہو۔ اب دیکھیں دستور میں بارھویں ترمیم اسے قابو کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔ یہاں ہوتا یہ رہا ہے کہ ادھر قانون مرتب کرنے کی کوشش ہو رہی ہوتی ہے اور ادھر قوانین شکن عناصر اس قانون سے گریز یا فرار کی راہیں تراش رہے ہوتے ہیں۔ قانون نتیجہ خیز ہو تو کیسے ہو! یہ جو ہمارے ہاں اچھے اچھے قوانین کی موجودگی میں جرائم کی

[illegible] ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دلوں میں قوانین کا احترام نہیں پیدا ہوا۔ اور یہ احترام تغیرِ نفس کے بغیر [illegible] ہے اور تغیرِ نفس صحیح تعلیم و تربیت اور اربابِ اثر و اقتدار کی سیرت و کردار کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے [illegible] کے لئے پانی کی پتیلی چولہے پر رکھیں، لیکن نیچے آگ نہ جلائیں۔

ہمارے اربابِ اثر و اقتدار (سیاستدان، عمائدِ مذہب اور ارکانِ نظم و نسق) کی کامل بیالیس برس سے یہ روش چلی [illegible] ہے کہ انہوں نے اسلام کو تعویذ سمجھ رکھا ہے جسے وہ اپنی اپنی دکانوں کے دروازوں پر لٹکا کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب جنات اور شیاطین کا کوئی خطرہ نہیں رہا۔ نظریۂ پاکستان کے الفاظ اٹھتے بیٹھتے دہرائے جاتے ہیں لیکن کسی نے آج تک متعین طور پر نہیں بتایا کہ یہ نظریہ ہے کیا۔ دو قومی نظریہ، جو اسلام کی ایک بنیادی حقیقت ہے اور جو مطالبۂ پاکستان کی مستحکم دلیل تھی، کو عملاً ختم ہی کر دیا گیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہماری نئی نسلیں اس نظریہ سے ہی بیگانہ ہو گئی ہیں۔ اب ہماری نئی نسل کے نوجوان پوچھتے ہیں کہ جس مملکت کا خواب علامہ اقبالؒ کی چشمِ بیدار نے دیکھا اور جس کا تصور قائداعظمؒ کی نگہِ بلند نے دیا، کیا یہ وہی پاکستان ہے جہاں آج جینا دوبھر ہو گیا ہے؟ یا حصولِ پاکستان کے بعد بھی اس متصورہ مملکت کا بدستور انتظار ہے؟ بقول شاعر ؎

نہ ہے لبوں پہ تبسم، نہ ہے نظر میں پیام
وہ آ گئے ہیں مگر انتظار باقی ہے

لیکن اب تو یہ انتظار کی صبر آزما گھڑیاں، ہجر کی تیرہ و تار راتوں کی طرح اس قدر طویل ہو گئی ہیں کہ چیخ چیخ کر پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ:

گُم ہوئی ہے کہاں کلیدِ سحر؟	گردشِ روزگار، کچھ تو کہو
گُم شدہ راستوں کے ویرانو	داستانِ غبار، کچھ تو کہو
کیا کہیں غم کی انتہا بھی ہے؟	غم کے پروردگار، کچھ تو کہو

پھر سوچتے ہیں کہ کیوں ہم "غم کے پروردگار" سے پوچھیں، اور کیوں شب کی تنہائی میں ستاروں سے پوچھیں کہ "تم نے تو وہ شب دیکھی ہو گی جس شب کی سحر ہو جاتی ہے"۔ کیوں نہ اپنے دل سے پوچھیں کہ ان تمام ہنگامہ خیزیوں ان تمام قیامت خیزیوں، جن سے ہم گزرے ہیں اور گزر رہے ہیں، کا اصلی سبب کیا ہے؟

اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم؟ (اقبالؒ)

یہ سوال بڑا اہم ہے۔ اگر اس کی صحیح تشخیص ہو جائے تو پھر اس بگاڑ کا علاج، جس میں ہمارا معاشرہ گرفتار ہے، چنداں مشکل نہیں ہو گا۔ مشہور فلاسفر پروفیسر وائٹ ہیڈ نے کہا ہے کہ اگر کسی پرابلم کو (DEFINE) کر دیا جائے تو

اس سے آدھا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ تو آیئے دیکھیں کہ ہمارے معاشرے کا مرکزی بگاڑ کیا ہے؟

مرض اور اس کا علاج

جس ذہنی انتشار اور عملی خلفشار میں مملکتِ پاکستان اور ملّتِ پاکستان دونوں آج اس بُری طرح گرفتار ہیں اور جو ہمیں دن بدن تباہی کے جہنّم کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہا ہے، اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ ہمارا اپنے نظریات حیات اور تصوّرات زندگی پر سے یقین اٹھ گیا ہے، جن پر نظریۂ پاکستان اور تحریکِ پاکستان کی بنیادیں اٹھی تھیں۔ یاد کیجئے! ہم نے پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد اس دعویٰ پر رکھی تھی کہ اسلام میں قومیّت کا مدار اشتراکِ وطن نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کی یکسانیّت (دین) ہے۔ لیکن پاکستان ملنے کے ساتھ ہی مختلف گوشوں سے ایسی آوازیں اٹھنی شروع ہو گئیں جو اس امر کی غمازی کرتی تھیں کہ معیارِ قومیّت کے متعلق جو کچھ ہم تحریکِ پاکستان کے دوران کہتے تھے، اس پر ہمیں یقین نہیں تھا۔ وہ ہمارے دل کی آواز نہیں تھی۔ لیکن ہم اس کا کھلے بندوں اعتراف بھی نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے قول اور عمل میں تضاد واقع ہونا شروع ہو گیا۔ اس سے ہماری قوم کے تشخّص (PERSONALITY) میں تشتّت و انتشار (DISINTEGRATION) واقع ہو گیا۔ اس تشتّت و انتشار کو منافقت کہتے ہیں۔ منافقت خود غرضی یا نفسا نفسی کو جنم دیتی ہے جو ہمارے معاشرے میں وبا کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہم میں قومیّت کی اجتماعی زندگی کا شعور ہی موجود نہیں۔ ہم سب انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس لئے ہمارے سامنے انفرادی مفاد سے بلند کوئی مفاد نہیں ہوتا۔ نہ چھوٹے کے سامنے نہ بڑے کے سامنے، نہ ادنیٰ کے سامنے نہ اعلیٰ کے، نہ غریب کے سامنے نہ امیر کے، نہ افسر کے سامنے نہ ماتحت کے، نہ مسٹر کے سامنے نہ مولانا کے۔ جب تک ہم میں قومی شعور بیدار نہیں ہوتا، پاکستان کی فلاح و بہبود کی کوئی شکل پیدا نہیں ہو سکتی۔ ملک کے چند افراد یا خاندانوں کا بے حد دولت مند ہو جانا اور ہوتے چلے جانا، ملکی بہبود کا آئینہ دار نہیں ہوا کرتا۔

اس انتشار (CHAOS) سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے۔ اگر ہم مسلمان کی زندگی جینا چاہتے ہیں تو ہمیں اس پر یقین ہونا چاہیئے کہ مسلم قومیّت کا معیار اشتراکِ دین ہے اور ہمیں اس معیار کے مطابق ایک امّت اور ایک ملّت بننا ہے۔ قوم میں اجتماعی زندگی کا شعور بیدار کرنے کے لئے ہمیں افرادِ قوم کے دلوں میں اپنے نظریات و تصوّرات کے متعلق ایک بار پھر ایسا کوہ آسا یقین پیدا کرنا ہوگا جیسا کہ تحریکِ پاکستان کے دنوں میں تھا۔ کیونکہ ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اس یقین کے بغیر ہم نہ ایک قوم بن سکتے ہیں اور نہ ہی داعیانِ نظریۂ پاکستان کی توقعات پر پورا اتر سکتے ہیں۔

داعیانِ نظریۂ پاکستان

داعیانِ نظریۂ پاکستان سے مراد وہ لوگ تھے جو اس عقیدہ پر یقین رکھتے تھے کہ وطنیت کے معیار کے مطابق قومیت کی تشکیل اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ (دیکھئے سورہ التغابن ۶۴ کی آیت ۲) اور جو اس حقیقت پر بھی ایمان رکھتے تھے کہ اسلام ۔ اللہ کا مقرر کردہ انسانوں کیلئے نظامِ حیات ۔ صرف اپنی آزاد مملکت میں نظامِ حیات (دین) کی شکل اختیار کر سکتا ہے ۔ اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو اس کے دین (نظامِ حیات) بننے کا امکان نہیں ہوتا ۔ اس صورت میں اسلام مذہب بن جاتا ہے اور اسٹیٹ (STATE) سیکولر (SECULAR)، جو یکسر غیر اسلامی تصور ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری سانس تک، مسئلۂ قومیت کی اسلامی نگاہ سے، وضاحت کرتے رہے اور اسی کی بنیاد پر انہوں نے مسلمانوں کیلئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا۔ وہ ملتِ اسلامیہ کو یہ پیغام دیتے دیتے عالمِ جاوداں کی طرف سدھار گئے، اور اس شمع کو ایسے ہاتھوں میں دے گئے جن کی امانت و دیانت پر انہیں پورا پورا اعتماد تھا۔ یہ تھے اللہ کے بندے محمد علی جناحؒ کہ جنہیں ملتِ اسلامیہ نے قائدِ اعظم کے برجستہ، موزوں ترین اور ان کے شایانِ شان لقب سے پکارا۔ رحمہما اللہ تعالیٰ۔

قائدِ اعظم نے پاکستان کی جنگ کو دس سال تک جاری رکھا اور بالآخر نہ صرف ہندوؤں سے بلکہ ساری دنیا سے اس حقیقت کو منوا لیا کہ مسلمان دین کے اشتراک کی بناء پر ایک جداگانہ قوم ہیں اور ایک الگ آزاد مملکت کے مستحق۔

حصولِ پاکستان کے بعد

آپ احباب کو معلوم ہے کہ تحریکِ پاکستان کی سب سے زیادہ مخالفت ہمارے علماء حضرات کی طرف سے ہوئی۔ یہ درحقیقت دین اور مذہب کی وہی کش مکش تھی جو ازل سے چل رہی ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی (اقبالؒ)

تحریکِ پاکستان کی مخالفت انگریز اور ہندو دونوں کی طرف سے ہوتی تھی۔ یہ مخالفت ہوئی اور شدت کے ساتھ ہوئی۔ ہندو نے اس مقصد کیلئے "نیشنلسٹ" (وطن پرست) مسلمان علماء کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے اس امر کی ضمانت دے دی کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں سیکولر انداز کی حکومت قائم ہوگی جس میں امورِ مذہبی بدستور علماء کے ہاتھ

ہیں رہیں گے۔ چونکہ یہ انداز، مذہبی پیشوائیت کو (SUIT) کرتا تھا اس لئے انہوں نے ہندوؤں سے مفاہمت کر لی اور تحریکِ پاکستان کی شدید مخالفت کی۔

مذہب پرست اور وطن پرست گروہوں کی تمام مخالفتوں کے باوجود پاکستان وجود میں آگیا لیکن سالارِ کارواں ہم سے جُدا ہو گیا۔ اس کے بعد

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۙ (۱۹ : ۵۹)

"اس کے بعد ایک طرف ایسے ناخلف پیدا ہو گئے جنہوں نے زندگی کے بلند مقاصد کو فراموش کر دیا۔ اعلیٰ اقدار کو ضائع کر دیا۔ اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے اٹل قانونِ مکافات کے مطابق، تباہیاں ان کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

دوسری طرف وہ عناصر (نیشنلسٹ علماء و دیگر مخالفین) جو آخری وقت تک پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے، نہایت ڈھٹائی سے پاکستان آگئے اور بڑے بڑے مقدس اور معصوم لبادوں میں اُس آتش انتقام کے فرو کرنے میں مصروف ہو گئے جو قائدِ اعظمؒ کے ہاتھوں شکستِ عظیم سے ان کے دلوں میں بھڑک اٹھی تھی۔ ان سب حالات نے مل کر ہمیں اس تباہی تک پہنچا دیا جس کے دہانے پر آج ہم کھڑے ہیں۔

ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت بالعموم ان علماء (یا ان کے شاگردوں) پر مشتمل ہے، جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ پاکستان میں اسلام بحیثیت مذہب تو زندہ رہے، نظام کی شکل اختیار کرنے نہ پائے جو نظریۂ پاکستان کا بنیادی تقاضا تھا۔ وہ اپنی ان کوششوں میں کافی حد تک کامیاب ہوئے۔ قوم کی نگاہوں سے نظریۂ پاکستان اوجھل ہو گیا۔ انہی علماء کی کوششوں اور رضامندی سے ۱۹۸۰ء میں دستور کے آرٹیکل ۲۲۷ میں ایک "تشریح" کا اضافہ کیا گیا جس کی رُو سے ہر مذہبی فرقہ، پرسنل لاز (شخصی قانون) کی حد تک "قرآن و سنت" کی تشریح و تعبیر اپنے فرقہ کی فقہ اور روایات کے مطابق کر سکتا ہے! قرآن حکیم تو فرقہ سازی کو شرک سے تعبیر کرتا ہے۔ (۱۶۰ : ۶ ، ۳۲۔ ۳۱ : ۳۰) لیکن اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اسلامی دستور نے اس "شرک" کو قانونی اور آئینی تحفظ فراہم کر دیا ہے! یا للعجب! اس "تشریح" سے نہ صرف نظریۂ پاکستان مسخ ہو کر رہ گیا بلکہ قرآن حکیم کو بھی "مہجور" بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ یہی وہ شکایت ہے جو نبی اکرمؐ، قیامت کے دن، ربّ العزت کے حضور، اپنی اُمّت کے بارے میں کریں گے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵ : ۳۰)

اور رسولؐ کہے گا کہ اے میرے ربّ! یہی ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو (اپنے خود ساختہ

معتقدات کی رسیوں سے) اس طرح جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ (یعنی انہوں نے اپنے آپ کو اس کے تابع رکھنے کی بجائے اسے اپنے مسلک و مشرب کے تابع رکھ چھوڑا تھا۔)

ہم نے قرآن حکیم کے ساتھ یہی کر رکھا ہے۔ لیکن کوئی نہیں سوچتا۔ نہ ہمارے لیڈر نہ ہمارے علماء اور نہ افرادِ قوم۔
اب پاکستان میں امورِ مذہب، مذہبی علماء کی تحویل میں ہیں اور امورِ سیاست حکومت کی تفویض میں۔ پرسنل اور پبلک لاز میں یہ تفریق یکسر غیر قرآنی تصوّر ہے۔ اسی کو تو سیکولرازم کہتے ہیں لیکن ہم کھلے بندوں اسے تسلیم کرنے سے جھجکتے اور جھینپتے ہیں۔ نیشنلسٹ علماء جو چاہتے تھے وہ انہوں نے حاصل کر لیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم بھی یہی چاہتے تھے؟ کیا ہم سیکولر پاکستان چاہتے تھے؟ کیا ہماری زندگی کا نصب العین، ہماری تمناؤں کا مرکز اور ہماری آرزوؤں کا محور یہی پاکستان تھا جہاں آج مذہبی فرقوں کا دَور دَورہ ہے؟ کیا یہی ہمارے تصوّر کا پاکستان تھا؟ لِلّٰہ! رکیئے اور سوچیئے۔ اپنے دل سے پوچھیئے کہ پاکستان کا نظریہ کیا تھا؟ اسلام یا سیکولرازم؟

دل میں اٹھا ہے درد تو اظہارِ درد کر
آنسو امنڈ پڑے ہیں تو منہ موڑ کے نہ جا

قوم کو یاد دلائیں

ہماری بدبختی یہی نہیں کہ ہم اس وقت تک، پاکستان کو اپنے تصوّرات کے مطابق متشکل نہیں کر سکے۔ اس سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ خود یہ تصوّرات ہی رفتہ رفتہ قوم کی نظروں سے اوجھل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ابھی یہاں، وہاں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں عملی حصّہ لیا جنہیں قائدِاعظمؒ کے ساتھ کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی جنہوں نے، ان کے ارشادات و پیغامات کو اپنے کانوں سے سُنا اور اپنی آنکھوں سے پڑھا۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ اٹھتے چلے جائیں گے۔ ان کے بعد ہماری آنے والی نسلوں کو کانوں سُنی اور آنکھوں دیکھی حقیقت بتانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا کہ پاکستان کیوں مانگا تھا اور اس سے مقصود و مفہوم کیا تھا؟ آیئے جو تھوڑا سا وقت ہمارے پاس ہے اس کو غنیمت جانیں اور قوم کو یاد دلائیں کہ:-

—— کہ ہم متحدہ ہندوستان کے تصوّر کو یہ کہہ کر ردّ کیا کرتے تھے کہ اس قسم کی مخلوط حکومت میں ہم اپنے دینی تصوّر کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ کے دین۔ اسلام۔ کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرنے کی صورت یہی تھی کہ قرآنِ حکیم کو عملی زندگی کا ضابطہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہی وہ کوشش تھی جو ہمارے

زمانے میں تحریکِ پاکستان کی شکل میں سامنے آئی۔

—— قوم کو یاد دلائیں کہ پاکستان کا تصوّر علامہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کا مرہونِ منّت ہے۔ انہوں نے اس مطالبہ کی بنیاد ہی اس حقیقت پر رکھی تھی کہ قرآنِ حکیم مسلمانوں کی عملی زندگی کا ضابطہ اسی صورت میں بن سکتا ہے جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اصول و احکام نافذ کئے جا سکیں۔ اسی کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں۔ یعنی ایک ایسی مملکت کا حصول جس میں اسلام، ایک عملی نظامِ حیات کی شکل میں کارفرما ہو۔ یہ بھی سُن لیجئے کہ نظریۂ پاکستان کوئی ہنگامی تصوّر نہیں تھا۔ یہ اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔

(دیکھئے سورۃ تغابن ۶۴/۲ ۔ سورۃ الحج ۲۲/۴۱ ۔ سورۃ النور ۲۴/۵۵)

—— قوم کو قائدِاعظم کا وہ قول یاد دلائیں جس پر جُوں جُوں غور کیجئے نگہ بصیرت وجد میں آجاتی ہے۔ اس سے نہ صرف مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اور وجۂ جواز ہی سامنے آجاتی ہے بلکہ خود اسلام کا ایک بنیادی اصول بھی اس طرح اُجاگر ہوتا ہے کہ اس سے بہت سے سیاسی عقدے حل ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے ۸۔ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔"

اس مختصر سے جُملے میں کتنی بڑی حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے یہی وہ اسلام کا اصل الاصول تھا جسے علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر!
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

—— قوم کو یاد دلائیں کہ ہماری ساری تباہیوں کا اصلی سبب یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد اس کی بنیادوں کی طرف کسی نے توجّہ ہی نہیں دی۔ یہی نہیں کہ ان کی طرف توجّہ نہیں دی گئی بلکہ اسے کھوکھلا کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔

—— قوم کو یاد دلائیں کہ جن قیامت خیزیوں سے ہم گزرے ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے پاکستان بننے کے بعد اپنی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام نہ کیا۔ نہ ہی ہم نے اس کے سامنے اس نصب العین کے چراغ روشن کئے جس کیلئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔ نہ ہی ان راستوں کی نشاندہی کی جو انہیں اس منزل تک پہنچا دے۔ اس غفلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم نظریۂ پاکستان کا مقصود اور مفہوم ہی بھول گئی اور

بھولے چلی آرہی ہے ہم اپنی منزل ہی بھول گئے۔

تماشا ایک ہی ہے تم اسے جس دور میں دیکھو
وہی بھولی ہوئی منزل وہی بھٹکے ہوئے راہی

—— قوم کو یاد دلائیں کہ جس مملکت کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اس کی منزل کا تعین، قرآنِ عظیم کی قندیلِ درخشاں کے سوا اور کون سی روشنی کر سکتی ہے۔ جب تک منزل کو متعین طور پر سامنے نہ لایا جائے، نہ کارواں اپنے مستقر تک پہنچ سکتا ہے، نہ متاعِ کارواں رہزنوں کے ہاتھوں محفوظ رہ سکتی ہے۔ قائدِ اعظمؒ کے بعد ہمیں کوئی ایسا میرِ کارواں نہ ملا جو قرآنی ذہن رکھتا ہو اور جو کتاب اللہ کی روشنی میں ہمیں ہماری صحیح منزل کی طرف راہنمائی کرتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ہمارے اونٹ کا بوجھ ایسا گرا کہ بکھرتا چلا گیا۔ اب اپنا سامان سمیٹ کر پھر سے منزل کی طرف رواں دواں ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے جیسے قرآن کریم بڑے ہی بلیغ انداز میں پیش کرتا ہے۔

—— قوم کو یاد دلائیں کہ جس گرداب میں ہم نے اپنے آپ کو پھنسا رکھا ہے اس سے نکلنے کا قرآنِ کریم طریقہ یہ بتاتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ..... (۴/۱۳۶)

اس آیت کا عام ترجمہ یہ ہے کہ:

"اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جسے اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے"

یہاں یہ بات بظاہر عجیب سی لگے گی کہ جن لوگوں کو اللہ خود "اے ایمان والو!" کہہ کر مخاطب کرتا ہے، انہیں ایمان لانے کیلئے کیوں کہا جا رہا ہے۔ یہ بڑی عظیم حقیقت ہے اور گہرے غور و فکر کی محتاج یہاں کہا یہ جا رہا ہے کہ اگر تمہارا دین بھی مذہب سے بدل جائے یعنی اگر تم اللہ کا مقرر کردہ مقصدِ حیات فراموش کر دو تو تمہارے کرنے کا کام یہ ہوگا کہ تم پھر سے اپنے اسی مقصد کو اپنے سامنے رکھو اور اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر صدقِ دل سے گامزن ہو جاؤ۔ یہی ہمیں کرنا ہوگا یعنی ہمیں بھی تجدیدِ مقصد کرنا ہوگا۔ اپنے ان نظریاتِ حیات پر جم کر کھڑا ہونا ہوگا جو نظریۂ پاکستان کی بنیاد ہیں۔ ایسا کئے بغیر، ان تباہیوں سے بچنے کی کوئی صورت نہیں جن میں ہمارا معاشرہ گھر چکا ہے۔

—— قوم کو یاد دلائیں کہ نظریۂ پاکستان قرآن کے دو لفظوں میں یہ ہے کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ

بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ (۵/۴۸) "حکومت اللہ کی کتاب کے مطابق قائم کرو" حضور نبی اکرمؐ نے یہی کیا۔ کیونکہ ان سے کہا گیا تھا کہ:

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ۵/۴۴

"یاد رکھو! جو لوگ اللہ کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں"

—— قوم کو نظریۂ پاکستان کی تشریح یاد دلائیں جو قائدِ اعظمؒ نے ان الفاظ میں کی تھی:

"اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے"

کاش ہمارے سیاستدان قرآنِ حکیم کو خود قرآن سے سمجھیں (مُلّا سے نہیں) تاکہ نظریۂ پاکستان کی تکمیل کی کوئی صورت تو نکلے

؎ میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُود و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو، میرے پیمانے کا ہے!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۲/۱۲۷)

اعزاز الدّین احمد خاں

ارشادِ قائدِ اعظمؒ

اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ پارلیمنٹ کی، نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی و پابندی کے حدود متعیّن کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔

علامہ غلام احمد پرویز

دو قومی نظریہ

یہ امتِ مسلمہ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں ایک قوم کہلائے گی۔ خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں بستی ہو —— اور اس امت کے علاوہ، دنیا کے تمام باشندے، دوسری قوم کے افراد۔ اس طرح ساری دنیا کے انسان، دو قوموں میں بٹ جائیں گے —— مسلم اور غیر مسلم —— قرآن کریم کے الفاظ میں:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲)

خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کچھ مومن ہو گئے اور کچھ کافر ——

یعنی پیدائش کے اعتبار سے صرف انسان پیدا ہوتے ہیں۔ پھر وہ نظریۂ زندگی کے معیار کے مطابق، دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک گروہ مومنین کا، دوسرا غیر مسلموں کا، اسی کو "دو قومی نظریہ" کہا جاتا ہے۔ یاد رکھئے! "دو قومی نظریہ"، نہ تو ہندوستانی باشندوں کی نسبت سے وجود میں آیا تھا اور نہ ہی یہ تحریک یا مطالبۂ پاکستان کا پیدا کردہ تصور تھا۔ یہ اسلام کی ایک ابدی صداقت ہے جو اس دن ظہور میں آئی تھی جب خدا نے پہلے پہل انسانوں کو وحی عطا کی۔ اور یہ ابد تک قائم رہے گی۔ دو قومی نظریہ (TWO NATION THEORY) کی اساس خود اسلام ہے۔ اس کا تعلق نہ پاکستان سے ہے نہ "بنگلہ دیش" سے جب تک دنیا میں ایک شخص بھی مسلم رہے گا، دو قومی نظریہ زندہ رہے گا۔

چونکہ اس سوال نے آج کل خاص اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس لئے اس کی مزید وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ میں نے بتایا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے۔

(۱) دنیا کے تمام مسلمان ایمان کے اشتراک کی بناء پر ایک قوم کے افراد ہوں گے۔ اس قوم (یا امت) کے اندر نسل۔ زبان۔ جغرافیائی۔ سیاسی حدود کے امتیاز سے مختلف قوموں کی تشکیل اسلام کے بنیادی تصور کے خلاف ہے اور

(۲) کوئی غیر مسلم اس (مسلم) قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا خواہ وہ انہی کی مملکت کے اندر کیوں نہ رہتا ہو۔ اسلام کی یہ بنیادی حقیقت مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ہم نے کوشش کی کہ ہندوستان میں ایک الگ خطۂ زمین حاصل کر کے اس میں اس تصور کا احیاء کریں اور جب یہ تصور یہاں عملاً قائم ہو جائے تو پھر اس سلسلہ کو

دوسرے ممالک کے مسلمانوں تک بھی بڑھایا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر ہم نے ہندوستان میں دو قومی نظریہ کی
اشاعت کی اور اس میں ہم بفضلِ ایزدی کامیاب ہو گئے۔ لیکن تشکیل پاکستان کے بعد ہم نے خود پہلے اس کے ایک حصّہ
کی تردید کر دی یعنی پاکستان کی حدود میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دے دیا۔ بالفاظِ دیگر
ابھی ابھی ہم ہندوستان میں کہہ رہے تھے کہ مملکتِ ہند میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد قرار
نہیں پا سکتے لیکن جونہی ہم نے واہگہ کی سرحد پار کی ہم نے اقرار و اعلان کر دیا کہ پاکستان کی حدود میں بسنے والے
مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد ہیں۔ ہم نے اس سے اسلام کا مذاق اڑایا۔ اپنا مذاق اڑایا اور دنیا کی نگاہوں میں
اضحوکہ بن گئے۔ لیکن فطرت کے اٹل قوانین نے ہمارا مذاق اس طرح اڑایا کہ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

اب ہم اس نظریہ کے دوسرے حصّہ کا مذاق اڑا رہے ہیں جب کہہ رہے ہیں کہ مغربی پاکستان کے مسلمان
ایک قوم نہیں بلکہ چار قوموں میں منقسم ہیں۔ یعنی یہاں کے مسلمان اور غیر مسلم تو ایک قوم کے افراد ہیں لیکن خود مسلمان
ایک قوم کے افراد نہیں۔ ان کی چار الگ الگ قومیتیں ہیں۔ یا للعجب!

میں برادرانِ عزیز! اس قرآنی بصیرت کی شہادتِ عظمیٰ کے زور پر جو مجھے بہ توفیقِ ایزدی حاصل ہوئی ہے۔ دل کی
پوری قوت سے اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں تصورات اسلام کے یکسر خلاف ہیں۔ یعنی یہ تصور کہ پاکستان (یا دنیا
کے کسی اور حصّہ) کے مسلمان اور غیر مسلم، وطن کے اشتراک کی بناء پر ایک قوم کے افراد ہیں" اور خود مسلمانوں کے اندر
مختلف قوموں کا وجود ممکن ہے۔ آپ اپنے سیاسی مصالح کی بناء پر جو جی میں آئے سمجھئے اور کیجئے۔ لیکن یہ دونوں
نظریات اسلام کے بنیادی تصورات کے خلاف ہیں اور اگر آپ اس مملکت کو اسلامی بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو ان
دونوں نظریات کو مردود قرار دینا پڑے گا۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام نے شعوب اور قبائل کا امتیاز روا رکھا ہے اور انہی کو ہم مختلف قومیتیں کہتے ہیں۔
شعوب و قبائل سے ان کا اشارہ سورہ حجرات کی اس آیت کی طرف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ (۴۹/۱۳)

لیکن اس آیت کو بطور دلیل پیش کرنے والے اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ یہ آیت خود ان کے دعوے کی تردید
کرتی ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ تمام انسانوں کو نر و مادہ کے اختلاط سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے
انسان ہونے کی جہت سے ان میں کسی قسم کا فرق اور امتیاز نہیں۔ اگر امتیاز ہے تو صرف ایمان کے اشتراک
اور سیرت و کردار کی بلندی کی رُو سے ہے۔ باقی رہے تمہارے قبیلے اور خاندان، سو ان کا مقصد اس سے
زیادہ کچھ نہیں کہ تم ایک دوسرے سے متعارف ہو سکو۔ زمانہ نزولِ قرآن کے عرب بالعموم صحراؤں میں خانہ بدوش

ی زندگی بسر کرتے تھے (وہاں اب بھی آبادی کی اکثریت کا یہی ہنجِ بود و ماند ہے۔ اس قسم کی صحرا نشینی کی ی میں بجز قبائلی نسبت کے ایک دوسرے کو پہچاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ قرآن کریم نے کہا کہ اسلام لانے ے بعد تم سب ایک امت کے افراد بن جاؤ گے۔ لیکن جب تک تم میں کوئی اور علامتِ تعارف پیدا نہ ہو، یوں اور خاندانوں کی موجودہ علامتیں یہ مقصد پورا کرتی رہیں گی۔ باہمی تعارف کی جب اور علامات وجود میں آجائیں ں تو قبیلوں اور خاندانوں کی علامتیں خود بخود مٹ جائیں گی۔ چنانچہ آج ہم جب اپنے ہاں کی تمدنی (شہری) ندگی کو دیکھتے ہیں تو اس میں ذاتوں اور گوتوں کی علامات وجہ تعارف نہیں رہیں۔ باہمی تعارف کا ذریعہ اور قسم کی علامات بن چکی ہیں۔ اس وجہ سے اب یہاں ذاتوں اور گوتوں کا تعارف نہیں رہا۔ بس یہ تھا مقصد عربوں کے ان شعوب و قبائل کی تعارفی علامات کے باقی رکھنے کا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں کہیں یہ محسوس ہوا کہ قبائلی امتیاز وجۂ تعارف سے آگے بڑھ کر کسی اور امتیاز کا موجب بن رہا ہے اسے شدت سے روک دیا گیا۔ ایک جنگ میں دو مسلم سپاہیوں میں کسی بات پر باہمی جھگڑا ہو گیا تو ان میں سے ایک نے (زمانۂ جاہلیت کے طریق کے مطابق غالباً غیر شعوری طور پر) اپنے قبیلہ کو پکارا اور دوسرے نے اپنے قبیلہ کو۔ جب حضورؐ کو اس کی اطلاع ملی تو آپؐ سخت برافروختہ ہوئے اور ان سے کہا کہ کیا تم لوگ اسلام لانے کے بعد، پھر عصبیتِ جاہلیہ کی طرف لوٹ گئے ہو؟ اور یہی وہ جاہلیت کی عصبیتیں تھیں جنہیں حضورؐ نے اس طرح اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ اب انہیں قومیتوں کا نام دے کر از سر نو زندہ کیا جا رہا ہے اور بجائے اس کے کہ اس پر ندامت محسوس ہو کہ ہم اس قسم کی غیر اسلامی حرکتیں کیوں کر رہے ہیں۔ سینہ تان کر کہا جاتا ہے کہ اسلام نے ان کی اجازت دی ہے جن لوگوں نے اسلام کو سمجھا تھا۔ ان کی تو کیفیت یہ تھی کہ جب حضرت سلمانؓ پارسی سے پوچھا گیا کہ نام، تو آپ نے کہا "سلمان" اور جب پوچھا گیا کہ باپ کا نام، تو آپ نے فرمایا "اسلام" وہ لوگ ولدیت کے امتیاز سے بھی امت میں تفرقہ پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور ہم آج اپنے مسلمان ہونے کے زمانے سے پہلے کے نسلی امتیازات اور انگریزوں کی کھینچی ہوئی صوبوں کی لکیروں کی تفریقات سے الگ الگ قومیتیں تشکیل کر رہے ہیں اور انہیں اسلامی قرار دے رہے ہیں۔

کس قدر مظلوم ہے آج دنیا میں اسلام کہ جس کا جو جی چاہے، اس کی طرف منسوب کر کے اسے بدنام کرتا پھرے، کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ یاد رکھیے! جب تک ہم بلوچ، سندھی، پنجابی، پٹھان کے امتیازات کو مٹا نہیں دیں گے اسلام کے حصار میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔

ماخوذ از طلوعِ اسلام ۱۹۷۳ء (جنوری)

علامہ غلام احمد پرویزؒ

سیکولر اسٹیٹ کی وضاحت

سوال یہ ہے کہ سیکولر اسٹیٹ کسے کہا جاتا ہے۔ اجمالاً اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جو اسٹیٹ اسلامک نہیں وہ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے سیکولر ہے یعنی اسلامی نقطۂ نگاہ سے غیر اسلامی مملکت (UN-ISLAMIC STATE) اور سیکولر اسٹیٹ مترادف الفاظ ہیں۔ تفصیل میں جانے سے یہ کہا جائے گا کہ جس اسٹیٹ کے فیصلے وحی کی رُو سے عطا کردہ مستقل اقدار اور غیر متبدّل اصول و احکام کے تابع ہوں گے وہ اسلامک ہوگی جس پر اس قسم کی پابندی نہیں ہوگی وہ سیکولر ہوگی۔

قرآنِ کریم نے ایک چھوٹی سی آیت میں اسلامک اسٹیٹ اور سیکولر اسٹیٹ کا فرق نکھار اور ابھار کر بیان کر دیا ہے جب کہا کہ

(۵/۴۴) مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ

جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ یعنی جو مملکت ما انزل اللہ کے تابع رہتی ہے وہ اسلامی ہے جو اس کے کنٹرول کو تسلیم نہیں کرتی وہ سیکولر ہے۔ سیکولرازم کی وضاحت لینن نے واضح الفاظ میں کر دی تھی جب کہا تھا کہ:

> "ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصوّر کے پیدا کردہ ہیں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصوّر فریب ہے دھوکا ہے۔ سرمایہ داری کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق احکامِ خداوندی پر مبنی ہے (ہم اس دعوے کو ٹھکراتے ہیں) ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے ہم اسے مانتے ہی نہیں۔ اخلاقِ انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے اس سے ماوراء جو کچھ ہے فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں۔ ہم ان سب کا پردہ چاک کر دیں گے۔"

آپ یہ نہ سمجھئے کہ سیکولرازم کمیونسٹوں تک محدود ہے۔ نہیں۔ سیکولرازم کا ہر جگہ انداز یہی ہے۔ آج دنیا

ہر جگہ سیکولر اسٹیٹس قائم ہیں۔ ان اسٹیٹس کا انداز یہ ہے کہ وہ امورِ مملکت میں مذہب کو دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مذہب انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے اس لئے اسے اس کی نجی زندگی تک محدود رہنا چاہیئے۔ ہر ہر فرد کو اجازت ہے کہ وہ جس قسم کا مذہب جی چاہے اختیار کرے اسی طرح جیسے ہر فرد کو اجازت ہے کہ وہ جس قسم کے چاہے کپڑے پہنے یا جس قسم کا راگ جی چاہے سنے۔ لیکن مذہب یا اخلاق مملکت پر کسی قسم کا کنٹرول نہیں کر سکتے۔ اسی کو مذہب اور سیاست کی ثنویت (DUALISM) کہتے ہیں۔ اس سے پرائیویٹ اور پبلک ضوابطِ اخلاق کی تفریق پیدا ہو جاتی ہے جس کے متعلق جوڈ لکھتا ہے کہ مغربی نظامِ سیاست میں :

"پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کیلئے ضابطہ کچھ اور۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانت دار، رحمدل اور قابلِ اعتماد ہوتے ہیں ان کا بھی عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے . . . . نمائندوں سے معاہدہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کر گزرنا کارِ ثواب ہے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصوّر کرتے تھے۔"

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS)

اور اسی حقیقت کو اٹلی کے مدبّر (CAVOUR) نے سمٹا کر ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

"اگر ہم اپنی ذات کیلئے وہی کچھ کریں جو کچھ ہم نے مملکت کیلئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیطان کہلائیں۔"

یہی وہ ثنویت ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو\
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لبرل سیکولرازم زیادہ سے زیادہ اتنا کرتی ہے کہ ہر مذہب کے پیرؤوں کو اجازت دیتی ہے کہ وہ مذہبی جس قسم کے جی چاہے رکھ لیں اور اپنے شخصی قوانین (پرسنل لاز) جیسے جی چاہے مرتب اور اختیار کر لیں۔ اس سے آگے وہ مذہب کو کسی دائرے میں دخیل کار نہیں ہونے دیتی۔ تقسیمِ ہند سے پہلے ہندو اسی قسم کی سیکولر اسٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اور نیشنلسٹ مسلمان اور ان کے مذہبی راہنما، علمائے کرام، اسے عین اسلام قرار دیتے تھے۔ اسی کے خلاف ہماری جنگ تھی، کیونکہ یہ تصوّر ایک کافرانہ اسٹیٹ کا

ہوسکتا ہے۔ اسلامی اسٹیٹ کا نہیں۔ عقائد اور پرسنل لاء تک اسلام کو تسلیم کرنا اور باقی شعبۂ حیات کو
کے خودساختہ قوانین کے تابع رکھنا۔ اس قسم کا کفر ہے جسے قرآن کریم نے سنگین ترین جرم قرار دیا ہے۔ اس کا
ہے اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ کیا تم ایسا چاہتے ہو کہ اس کتاب
کے ایک حصّہ پر ایمان لاؤ اور دوسرے حصّے سے کفر برتو فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ
مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى
اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/ ۸۵)۔ سو تم میں سے جو بھی ایسی روش اختیار کرے گا اس کا نتیجہ اس کے
سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیاوی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہوگا اور قیامت کے دن بھی عذاب عظیم میں گرفتار
اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جو لوگ یہاں سیکولر اسٹیٹ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ قرآن کی بارگاہ
سے ان کے متعلق کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔

(ماخوذ از طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۷۳ء)

نظریۂ پاکستان

ہم نے دیکھا ہے کہ اسلام بحیثیت دین (نظام زندگی) اسی صورت میں کارفرما ہوسکتا ہے جب اس کی اپنی
آزاد مملکت ہو۔ اگر اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو یہ صرف مذہب کی شکل میں باقی رہ سکتا ہے ہندوستان میں اسلام مذہب
کی حیثیت میں باقی رہ سکتا تھا۔ دین کی شکل اختیار نہیں کرسکتا تھا اسے دین کی صورت میں متشکل کرنے کیلئے ہم نے ایک آزاد
مملکت کے حصول کا مطالبہ کیا۔ اسی کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں یعنی ایک ایسی مملکت کا حصول جس میں اسلام ایک عملی نظام حیات
کی شکل میں کارفرما ہو۔ بنا بریں نظریۂ پاکستان بھی کوئی ہنگامی تصور نہیں تھا۔ یہ اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ داعیانِ نظریۂ
پاکستان سے مراد وہ لوگ تھے جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے تھے کہ اسلام صرف اپنی آزاد مملکت میں دین کی شکل اختیار
کرسکتا ہے اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو اس کے دین بننے کا امکان نہیں ہوتا۔ اس صورت میں اسلام مذہب بن جاتا ہے
اور اسٹیٹ سیکولر جو یکسر غیر اسلامی تصور ہے۔

(ماخوذ از طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۷۳ء)

ثریا عندلیب

ضیائے فکرِ قرآنی

الفاظ کا بدل دینا بڑی گہری نفسیاتی چیز ہوتی ہے۔ گناہ اور جرم کو الگ الگ کر دیا جاتا ہے۔ یوں گناہ کے الفاظ سے دماغ پر وہ بوجھ محسوس نہیں ہوتا جو جرم سے ہوتا ہے۔

فی سبیل اللہ جنگ یہ ہے کہ کسی بھی مظلوم کی فریاد پر دشمن کے آگے سینہ سپر ہو جانا۔

نگاہ کا فرق نتائج میں فرق پیدا کر دیتا ہے

خدا کے فضل کا مروّجہ تصوّر اپنے لئے شکست کے موقع پر ایک سپر ہے۔ اس کا فضل کہہ کر شکست کے موقع پر بھی اپنے آپ کو بچا لینے کا مکر۔ اپنی ذمہ داریوں سے گریز کی راہ۔

خدا اسی مملکت، اسی فضا، اسی مقام میں عملاً موجود ہوتا ہے جہاں اس کے قوانین کارفرما ہوتے ہیں۔

غلط راستے کی قدرت رکھتے ہوئے صحیح راستہ اختیار کرنا، یہ ہے شرفِ انسانیت۔

حسنِ عمل کا نتیجہ پہلے اس دنیا میں زندگی کا حسین ہو جانا ہے کہ حسن و توازن کی حامل زندگی ہی آخرت کی سرفرازیوں کی مستحق بنتی ہے۔

دین کی بنیاد خدا کا صحیح تصوّر ہے۔ خدائے واحد کا تصوّر اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ کروڑوں انسانوں کے ذہن میں ایک ہی تصوّر ہو۔ قرآن کا بنیادی منصب و مقصد یہ ہے کہ یہ خدا کا صحیح تصوّر دیتا ہے۔ اس کی ساری تعلیم اسی ایک محور کے گرد گھومتی ہے۔ (۱۷ : ۳)

انسان کے اچھے کاموں سے خدا کا کچھ بنتا نہیں۔ بُرے کاموں سے خدا کا کچھ بگڑتا نہیں۔ (۱۰۵ : ۶)

سیدھے راستے پر چلنا یا غلط راہ اختیار کرنا انسان کی اپنی ہی ذات سے تعلّق رکھتا ہے۔ (۷ : ۱۲)

ولی اللہ اور اللہ ولیّ۔ انسان خدا کا دوست یعنی وہ اس کے قوانین کی اطاعت کرتا ہے اور خدا انسان کا دوست یعنی وہ اس کی حفاظت کرتا ہے

یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ تم کس قسم کا ہونا چاہتے ہو۔

جو لوگ ٹیڑھا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ خدا انہیں صحیح منزل تک نہیں پہنچتا۔ اس نے غلط راستہ اختیار کیا ہے وہ غلط

جگہ پہنچے گا۔

۱۴ معیارِ خداوندی یہ نہیں کہ معصوم ہوں گے تو جنّت میں جائیں گے معیار میزان ہے یعنی خیر کے پلڑے کا جھکا ہونا۔

۱۵ خدا اس کا محتاج نہیں کہ ہم اس کی پرستش کریں تو وہ خدا رہے اور ہم خدا کی پرستش چھوڑ دیں تو وہ خدا نہ رہے۔ میں خدا کو مانتا ہوں کے معنی یہ ہیں۔ کہ جسے خدا نے خیر اور بہتری قرار دیا ہے میں اسے خیر اور بہتری سمجھتا ہوں اور جسے اس نے شر اور بدی کہا ہے اسے شر اور بدی سمجھتا ہوں اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہوں۔

۱۶ ہوسِ زر کی بدولت معاشرے میں کوئی قدر باقی نہیں رہتی۔

۱۷ دینِ اسلام کیا ہے؟ ایک ایسے معاشرے، تہذیب، نظام کا قیام جو انسانیّت کو عدل و انصاف سے متمتّع کر سکے

۱۸ اگر ایک جماعت اپنے آپ کو مومن کہتی ہے اور کفار اس پر غالب ہیں تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ جماعت مومن نہیں ہے اسے قرآن کے مطابق ایمان و عمل اختیار کرنا ہوگا۔

۱۹۔ جس چیز کو خدا نے اپنی کہا ہے اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام نوعِ انسان کے مشترکہ فائدے کیلئے ہے اس پر کسی کا ذاتی تصرّف یا قبضہ نہیں ہو سکتا۔

۲۰ عورت کو یہ بنیادی نکتہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ اس کی فوز و فلاح اس حقیقت کو اپنے دل میں گھر کر لینے سے ہوگی کہ اسے بھی خدا نے ایک مکمّل انسان بنایا ہے اور بحیثیت انسان آزادی اور عزتِ نفس سے مزیّن زندگی گذارنا اس کا پیدائشی حق ہے۔

۲۱ جسم کا ذات پر غالب آجانا خواہشاتِ نفسانی کو خدا بنا لینا ہوتا ہے اور ذات کا جسم کو زیر رکھنا انسانیت کو نشو و نما دینا ہے۔

۲۲ انسانی سطح کی زندگی ہدایتِ خداوندی کی روشنی میں چلنے سے ملتی ہے۔ (۱۲۳ : ۶)

۲۳ قرآن اس کے لئے تذکیر ہے جس میں زندگی کی رمق ہو۔ (۷۰ : ۳۶)

۲۴ (۱ : ۱۴) آیتِ کریمہ میں قرآن کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے ذریعے نوعِ انسان ظلمت سے نور کی طرف آسکتی ہے۔ اس میں لفظ ظلمات (تاریکیاں) جمع کے صیغے میں آیا ہے جس سے مراد ہر قسم کی تاریکیاں ہیں۔ **عقائد و تصوّرات** کی تاریکیاں۔ رسوم و مناسک کی تاریکیاں۔ متمدّن معاشرت کی تاریکیاں۔ سیاست و معیشت کی تاریکیاں۔ غرضیکہ قرآنِ مبین زندگی کے ہر گوشے کی تاریکی سے روشنی کی طرف لانے والی کتاب ہے۔

۲۵ جو مملکت، ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجہ میں حاصل ہو اسے خلافت سے تعبیر کیا جائے گا جس سے مقصد دین کا تمکّن ہے (۵۵ : ۲۴)

۲۶ اللہ کے وعدہ سے مراد ہوتی ہے اس کا متعیّن فرمودہ قانون یا اصول۔ یہ قوانین یا اصول غیر متبدّل ہوتے ہیں

اسی لئے کہا گیا ہے کہ خدا کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ خدا کا یہ غیر متبدل قانون ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔ یعنی دنیا میں اپنی آزاد مملکت کا قیام۔ اس سے ایمان اور اعمالِ صالحہ کے پرکھنے کی ایک واضح اور محسوس کسوٹی ہمارے سامنے آگئی۔ یعنی جس ایمان اور جن اعمال کا نتیجہ استخلاف فی الارض نہیں نہ وہ ایمان معیارِ خداوندی کے مطابق ایمان ہے نہ وہ اعمال، اعمالِ صالحہ۔

۲۔ جس مملکت کا مقصد دین کا تمکن نہ ہو وہ خلافت نہیں ملوکیت ہوگی اور ملوکیت دنیا میں ہر فساد کی جڑ ہے۔

۳۔ خالق کو اس کے اپنے مقام پر رکھو اور مخلوق کو اس کے مقام پر پھر کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔ (۱۱ : ۳۱)

۴۔ اللہ کے عطا کردہ رزق کی محمدی تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ کسی شخص کو اس کی ضرورت سے زیادہ نہیں ملتا۔ اور کسی شخص کی ضروریاتِ زندگی رُکی نہیں رہتیں۔

۵ امت میں اختلافات اس لئے پیدا ہوئے کہ ان میں ایک نظام اور ایک مرکزی اتھارٹی نہ رہی اور معاملات کے تصفیہ کیلئے خارج از قرآن چیزوں کو سند اور حجت سمجھ لیا گیا۔ اختلافات قرآن سے پیدا نہیں ہوتے۔ قرآن کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینے سے پیدا ہوتے ہیں۔

مسلمان

یہ لفظ استعمال کے لحاظ سے دنیا کے ہر گوشے میں بیک وقت کروڑوں زبانوں پر ہوتا ہے لیکن مفہوم کے اعتبار سے اس کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی دو ذہن بھی اس کی متفق علیہ DEFINITION متعین نہیں کر سکتے۔

قرآن کریم میں یہ لفظ (مسلمان) اس شکل میں نہیں آیا۔ اس کی جگہ اس میں **مسلم** کا لفظ آیا ہے۔ جس کی جمع **مسلمون** اور **مسلمین** آتی ہے۔ معنوی لحاظ سے **مسلم** سے مراد ہوگی قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والا یعنی الاسلام کا پیرو۔ لیکن اس کا یہ مفہوم تو الدّین کی رُو سے ہوگا۔ جس میں اسلام کو بطور نظامِ حیات اختیار کیا جائے گا۔ مذہب میں چونکہ خود اسلام کا مفہوم متعیّن نہیں۔ اس لئے مسلمان کا مفہوم اس طرح متعیّن ہو سکتا ہے یہ وجہ ہے جو ہمارے علمائے کرام مسلمان کی کوئی متفق علیہ تعریف متعیّن نہیں کر سکتے۔ یہ علماء خود مذہبی پیشوا ہیں۔ دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ دین میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

(ماخوذ از طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۷۳ء)

حنیف وجدانی

سیاسی پارٹیاں اور اسلام

(گذشتہ سے پیوستہ)

روزہ ــــ صوم

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۲/۱۸۳)۔

پہلی امتوں میں روزہ کیا تھا وہ کیسے رکھتے تھے اور مقاصد کیا کچھ پیش نظر تھے۔ اس بارے میں اتنا معلوم ہے کہ یہودی روزہ میں کلام نہیں کرتے تھے اور جہاں تک عیسائی حضرات کا تعلق ہے انجیل مقدس میں روزہ کے بارے میں صرف یہ اشارات ملتے ہیں (اگر سابقہ کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے تو انہیں پڑھنا بھی چاہیئے)

"اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ انہیں روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو۔

(انجیل مقدس۔ متی ۱۷ـ ۶/۱۶)

ایڈیشن ۱۹۰۴ء۔ پنجاب انگزلری بیبل سوسائٹی لاہور۔

س سے معلوم ہوا کہ یہودیوں کے برعکس عیسائی حضرات کے ہاں روزہ عام دنیوی روش کو رہبانیت کی طرف نہیں لے جاتا بلکہ اس میں سر میں تیل ڈالنے (یعنی زیب و زینت خوشبو) اور منہ دھونے (یعنی غسل، صفائی، پاکیزگی) کا تصور کہیں زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے عصرِ حاضر میں صرف فکرِ انسانی کو کافی جان رکھا ہے اور انجیل مقدس کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔

اب ہم روزہ (صوم) یا فلسفۂ رمضان شریف کی طرف آتے ہیں ______ لیکن

★ پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ آج ہمارے ہاں روزہ کا کیا رواج ہے اور اس فرض کی کیا اہمیت رہ گئی ہے

۱۔ لوگ شوق سے یہ مشکل فرض پورا کرنے والے بہت کم ہیں۔ اس کی بڑی وجہ فلسفۂ رمضان کے اجتماعی پروگرام کی عدم موجودگی ہے۔

۲۔ میں ایک جگہ بیٹھا تھا۔ ایک آنے والے صاحب نے دوسرے سے پوچھا۔ ہاں جی سنائیے روزہ ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ بھئی نماز نہ پڑھی جائے تو روزہ نہیں ہو سکتا۔" اس سے نہ رکھنا بہتر بہتر ہے۔

۳۔ ایک شخص نے کہا۔ بھئی ہم جھوٹ نہیں چھوڑ سکتے۔ جھوٹ بولیں اور پھر منہ بھی بند رکھیں کیا فائدہ اس سے بہتر ہے کھاتے پیتے رہو۔

۴۔ ہمارے ہاں روزہ کے بارے میں اخلاقی قوانین موجود نہیں کہ کسی کو کم از کم یونین کونسل میں ہی جوابدہی تو کرنا پڑے۔

۵۔ دین و دنیا کی تفریق نے روزہ کو بہت متاثر کیا ہے۔

۶۔ علماء و مشائخ، جو روزہ کا درس دیتے ہیں۔ وہ یہی جرم کرنے لگے ہیں۔

۷۔ سفر کو ایک بہانہ بنا لیا گیا ہے۔ جو بس پر آرام دہ سفر کرتا ہے۔ وہ بھی روزہ کو خیرباد کہہ دیتا ہے

۸۔ قضا روزہ کی تاکید کا رواج بہت کم ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بحالتِ موجودہ روزہ (صوم) کا وہ مقصد پورا نہیں ہو رہا ہے جو اس فلسفہ کی غایت انعابات تھیں۔ اب ہم اس کی قرآنی اہمیت اور نظامِ مساجد کے تحت روزہ کے فلسفہ پر روشنی ڈال لیتے ہیں۔

۱۔ صوم کے بنیادی معنی اپنے آپ کو روکنے یا ضبطِ نفس کے ہیں۔

۲۔ صائم کے معنی ہیں اپنے آپ کو غلط راستوں سے روکنے والا اور ضبطِ نفس رکھنے والا۔

اگر اس کا سب سے بڑا مقصد اپنے آپ کو حرام سے روکنے والا اور یوں اس پر ثابت قدم رہنے والا لیا جائے تو رمضان کا فلسفہ یوں بنتا ہے۔

ا۔ مسلمان کے دو رونے ہیں۔

I۔ رمضان شریف میں مقررہ وقت تک حلال چیزوں سے پرہیز کرنا تاکہ

II۔ وہ پوری زندگی میں حرام چیزوں سے اجتناب کرے۔

یعنی رمضان شریف میں حلال چیزوں پر پابندی کی ٹریننگ ہے تاکہ وہ باقی گیارہ (۱۱) ماہ میں بھی حرام سے بچنے کا طویل روزہ دار رہے۔ یہ مقصد عام طور پر لوگوں کو نہیں بتایا جاتا اور خواہ مخواہ کے وقتی بہانوں سے لوگ روزہ چھوڑ دیتے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روزہ اجتماعی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ ایک قسم کی سپاہیانہ ٹریننگ ہے اگر مسلمان اپنے آپ کو سپاہی شمار کرے اور پوری زندگی سپاہیانہ زندگی بسر کرے اور اس سپاہی کے لئے حرام کا روزہ کچھ اہمیت رکھنے لگے تو روزہ نہ رکھنے کے چانس اتنے کم ہو جائیں کہ کسی کو نظر ہی نہ آسکیں۔

اگر نظامِ مساجد قائم ہو اور اسلامی حکومت کی زیرِ نگرانی ہو تو اعتکاف فی المساجد کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہاں کورس کرنے والے زیرِ تربیت کس طرح معاشرہ کے لئے اہم ترین ہوں گے جب کہ آج کا اعتکاف آپ کے سامنے ہے۔ اس کا معاشرہ پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔

سفر کے بارے میں جدید اخلاقی قوانین وضع کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

جیسا کہ میں (سوال ۱۲ میں) لکھ چکا ہوں کہ لاہور کے غلام محمد صاحب کس طرح حکومتی جمعہ پر زور دے رہے ہیں۔ اسی طرح کم از کم سرکاری ملازمین میں روزہ کا احتساب ایک بنیاد قرار دیا جائے۔ جبکہ آج سرکاری ملازم پولیس والے اور انتظامیہ کے نمائندے دیہات میں جاتے ہیں اور کھلم کھلا روزہ کھاتے ہیں۔ حاکم کو رعایا کس طرح روک سکتی ہے۔

ارکانِ دین (زکوٰۃ)

اس کی تفصیل سوال ۳ کے جواب میں درج کی جا چکی ہے۔ اسے وہاں دیکھ لیا جائے جہاں بتایا جا چکا ہے کہ اسلامی معاشرہ دینے والوں پر مشتمل ہے۔ دینے والے یہ کچھ حق سمجھ کر دیتے ہیں کیونکہ اس سے ان کی شخصیت (انا۔ خودی۔ میں۔ ا۔ رُوح) کی تعمیر ہوتی ہے اور دینے کے اس حق کا تذکرہ قرآنِ کریم میں ۱۴۱/۶ ۲۶/۱۷، ۳۸/۳۰، ۱۹/۵۱، ۲۵-۲۴/۷۰، ۲/۲۳۶ میں موجود ہے۔

مردِ مومن دوسروں کیلئے رزق سے انفاق کرتے ہیں (۳/۲، ۵۴/۲۸، ۱۶/۳۲، ۳۸/۴۲، ۲/۲۵۴، ۲/۸، ۳۵/۲۹، ۲/۶۶۷)

یہاں انفاقِ رزق کی کوئی حد مقرر نہیں ہے بلکہ دیئے جانے کا ذکر ہے۔ نیز مال سے انفاق کا تذکرہ یوں ہے: ۲/۲۶۲، ۲۳/۲۲، ۲/۲۷۴، ۱۳/۲۲، ۱۴/۳۱، ۳/۶۲، ۹/۲۰، ۹/۹۹، ۴۷/۳۸، ۵۷/۱۰، ۷/۵۹۔

اس کے بعد صدقات دینے کا ذکر ہے: ۹/۵۱، ۹/۷۹، ۹/۶۰، ۹-۸/۷۶۔ لیکن یہاں کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔ البتہ دینے والوں کے اس معاشرے میں ضرورت سے زیادہ سب کچھ دینے کا ذکرِ خیر بھی موجود ہے (۲/۲۱۹ — ۷/۱۹۹) اور جو ضرورت سے زیادہ سب کچھ دینے کے بارے میں بحث کرنا شروع کریں۔ انہیں جاہلین کے زمرہ میں شمار کیا گیا ہے۔ اور آخرکار:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)

کے ذکرِ خیر سے اس کا طرۂ امتیاز نمایاں کر دیا گیا جو آج پورا نہیں ہو رہا۔ اس تمام بحث میں ۲½ فیصد زکوٰۃ کا کہیں تذکرہ نہیں۔ البتہ یہ بیان صرف ایک حدیث میں بسلسلہ صدقہ آیا ہے نہ کہ بسلسلہ زکوٰۃ۔

اگر بحالاتِ موجودہ قوانینِ زکوٰۃ کے تحت اس دینے کے جذبہ کو اجاگر کرنا مقصود ہے اور ایک قانون کے تحت اس کو پابند بنا دیا گیا ہے۔ تو اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آسکتا کہ اس موجودہ شرح ۲½ فیصد میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ نیز قوانینِ زکوٰۃ موجودہ اگر اس صورتِ حال کو زندہ نہیں رکھ سکتے اور دولت بدستور امیر طبقہ میں گردش کر رہی ہے تو پھر حالات کا تقاضا ہے کہ مندرجہ ذیل پر بھی غور فرمایا جائے۔

۱ ڈسٹرکٹ کونسل کے ہر حلقہ کو ایک بیت المال کے تحت لایا جائے۔ جہاں ہر وارڈ سے ایک ایک نمائندہ لیا جائے جو کم از کم تفسیر قرآن جاننے کی حد تک علمی قابلیت رکھتا ہو یہ کونسلر بھی

ہو سکتا ہو۔

۲ ڈسٹرکٹ کونسل کا نمائندہ اس بیت المال کا سرپرست اعلیٰ ہو۔

۳ یہ بیت المال کمیٹی اپنے علاقہ سے عشر زکوٰۃ۔ صدقات یکجا کرے اور بنکوں، ڈاکخانوں میں جمع کی جانے والی مقامی رقومات کی کٹوتی سے بھی ان کو ایک مخصوص حصّہ دیا جائے۔

۴ مہر میں لکھی جانے والی سونے کی مقدار پر بھی ٹیکس (زکوٰۃ) کو عاید کیا جائے تاکہ سونا ذخیرہ کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ہو۔

۵ کرنٹ اکاونٹ کی اوسط رقوم کی بنیاد پر بھی زکوٰۃ کٹوتی کو لازم قرار دیا جائے۔

۶ بنکوں کے سُود سے زکوٰۃ کٹوتی نہ کی جائے۔ کیونکہ یہ حرام رقم کے حلال میں ملانے کا اشتباہ ہے صرف اصل رقم سے زکوٰۃ کٹوتی کی جائے۔ اس سے سُود کے خلاف نفرت کی ایک بنیاد بھی فراہم ہو جائے گی۔

۷ مالکانِ پلازہ۔ مالکان سینما اگر اپنی رقوم روزانہ ماہوار یا سالانہ بینک میں جمع کراتے ہیں اور ٹیکس کا حساب دکھاتے ہیں تو بہتر ورنہ ان سے بھی زکوٰۃ کٹوتی کی تحریک کا آغاز کیا جائے کیونکہ یہ دولت کے بڑے حصار شمار ہوتے ہیں۔

۸ طالب علم اکاونٹ کو کالج کی حد تک ہر قسم کی کٹوتی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور کالج تعلیم کے جاری رہنے کا سالانہ ثبوت منسلک ہو۔

۹ بچّوں کے ہر قسم کے سکول فنڈ۔ کالج فنڈ کو زکوٰۃ کٹوتی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

۱۰ رضاکارانہ زکوٰۃ فنڈ میں دینوں والوں کیلئے اوپن اکاونٹ کا حساب کھولا جائے۔ مثلاً پنجاب میں اکاونٹ ۱۰۱ء۔ سرحد میں ۱۰۲ء۔ بلوچستان میں ۱۰۳ء۔ سندھ میں ۱۰۴ء۔ وفاقی علاقہ ۱۰۵ء ــــ اور آزاد کشمیر میں ۱۰۶ء۔ اس علاقہ کا کوئی بھی زکوٰۃ دہندہ بینک و وچر سے اس اکاونٹ میں زکوٰۃ رضاکارانہ جمع کرا سکے۔ اس سے کافی تحریک پیدا ہوگی

۱۱ زکوٰۃ کی تقسیم کا موجودہ ہر طریقہ صرف کراس بینک چیک تک مختص کر دیا جائے تاکہ بدعنوانی نہ ہو اور یہ کراس چیک اس قسم کے ہوں کہ بذریعہ ہیڈ آفس یا۔ جی پی۔او ہو تو ڈاکخانہ اکاونٹ میں بھی جمع ہو سکیں۔ اس سے بہت بڑی سہولت پیدا ہو جائے گی اور زکوٰۃ تقسیم کا آڈٹ بذریعہ کراس چیک تقسیم بہت آسان ہوگا اور ہر قسم کی بدعنوانی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

۱۲ مستحقینِ امداد کا تعین یوں کیا جائے جو ایک برفارما کی صورت میں ہو:۔

نام مستحق زکوٰۃ ــــ ولدیّت / زوجیت ــــ جائداد منقولہ / غیر منقولہ ــــ بینک اکاونٹ نمبر
برسرِ روزگار اولاد ــــ ملنے والا پی۔ایف۔فنڈ / پنشن کی تفصیل۔

اس سے اس صورتِ حال کی حوصلہ شکنی ہوگی۔ جو امیر بیوہ عورتیں بیوگی کے نام پر کر رہی ہیں اور غریبوں کا حق کھا جاتی ہیں۔ **جب تک** اس معاشرہ میں صرف ایک بار ضرورت سے زیادہ سب کچھ ملّت کیلئے دینے کا جذبہ پیدا نہیں کیا جاتا۔ ان امور پر غور فرمایا جائے اور موجودہ زکوٰۃ کے نظام میں یوں اصلاحات کی جائیں۔

ارکانِ دین (حج)

سوال ۱۲

ہم ایک سابقہ تشریح کا بارِ دگر اعادہ کرتے ہیں کہ انسان کیا ہے؟

انسان نام ہے!

۱۔ تن۔ بدن۔ جسم۔ فزیکل بادی۔ حیوانی لوازمات کی ترقی یافتہ متوازن و معتدل شکل اور
۲۔ مَن۔ رُوح۔ انا۔ خودی۔ اَ۔ میَں (PERSONALITY) نفس۔ انسانی ذات کے یکجا ہونے کا ــــ

ــــ اس سے انسان میں انسانیت۔ آدم (آدمی) میں آدمیّت۔ شخص میں شخصیّت۔ بدن میں روحانیت اور تن میں من کی دنیا ہے۔ اس جوہرِ خودی کی وجہ سے انسان احسنِ تقویم قرار پایا اور اسی قوتِ اختیار و ارادہ سے وہ اکثر مخلوق سے اشرف و افضل ہے۔ اس اہم ترین اعزاز کا تذکرہ اللہ تعالیٰ یوں کرتا ہے

وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهِ (۳۲/۹) وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي (۳۸/۷۲)

انسانی جسم مٹی کے خلاصہ در خلاصہ سے تیار ہوتا ہوا یہاں پہنچا۔ اس کا حسب و نسب رنگ اور قد کاٹھ ہے تمام دابہ کی طرح انسانی جسم بھی کائناتی قوانین کا پابند ہے۔ فانی ہے۔ **جبکہ رُوح** انا۔ اَ میَں۔ خودی۔ براہِ راست ایک وہبی عطیۂ خداوندی ہے۔ اس کا تعلق مادے سے نہیں اللہ سے ہے یہی وجہ ہے کہ انسانی ذات کا کوئی شجرۂ نسب نہیں ہوتا۔ علاّمہ اقبالؒ اس کیفیت کو "زادن لے اب و ام" سے تعبیر کرتے ہیں۔

انسانی ذات۔ روح۔ انا۔ اَ میَں کو عطیۂ خداوندی اور غیر مادی جاننے والے ایک قسم کے انسان ہیں جو ایک نوع یا ایک قوم شمار ہوں گے۔ جب کہ اس قوت کو کوئی اہمیّت نہ دینے والے اسے فانی شمار

کرنے والے۔ دوسری قسم نوع اور قوم کے افراد شمار ہونگے۔ ہم پہلی قسم نوع۔ قوم کو مسلم اور دوسری کو غیر مسلم کہیں گے۔

مسلم افراد اس اللہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں جس نے انہیں یہ انسانی ذات خودی عطا کی ہے وہ اس اللہ سے ہدایت کے متمنّی بھی ہیں اور اس کی آخری ہدایت قرآن کریم کے مطابق زندگی بسر کرنے کو: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (۲/۱۶۵) کے معیار پر لے جاتے ہیں۔

ان مسلم افراد کا معاشرتی مرکز مسجد اور عالمی مرکز بیت اللہ شریف ہے۔ یہ وحدتِ آدم۔ وحدتِ ملّت وحدتِ فکر۔ وحدتِ دعوت اور وحدتِ انسانیت کا بے مثال تصوّر وحدت ہے۔ علامہ اقبالؒ اس کی ترجمانی میں فرماتے ہیں:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر!

مسلم افراد کے اس سالانہ اجتماع کو "حج" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کی چند خصوصیات منفرد انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ جن کی مثال دیگر اقوامِ عالم اور مذاہب عالم میں کہیں موجود نہیں۔

بیت اللہ شریف کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور حضرت اسماعیل علیہ السّلام نے رکھی (۲/۱۲۷)۔ دنیا میں پہلا گھر تھا جسے نوعِ انسانی کے لئے بنایا گیا۔ (۳/۹۶)

- اس گھر کا حج فرض قرار دیا گیا۔ (۳/۹۶)
- مقامی اور غیر مقامی تمام انسانوں کیلئے یکساں حقوق رکھے گئے (۲۲/۲۵)
- بیت اللہ شریف کے گرد جو مسجد تعمیر کی گئی اسے مسجد الحرام کہا گیا۔ (۱۵۰-۱۴۹/۲)
- کعبہ کو قبلہ بنایا گیا۔ (۱۴۳-۱۴۲/۲)
- حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت (۵/۱)
- جو کعبہ تک نہ پہنچ سکے وہ اپنے ہدایہ (تحائف) بھیج سکتا ہے۔ (۱۹۶/۲)
- مساعی شرکتِ فی الحج ضروری ہیں لیکن یہ جہاد کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ (۱۹/۹)

"مسلم قوم" کے افراد (ملّتِ اسلامیہ) سالانہ اجتماع میں اپنے سابقہ اعمال کا جائزہ لے کر آئندہ کے پروگرام طے کریں۔ تاکہ نئی نسل کی تعلیم و تربیت سے وہ اسلامی نظام کے لئے جہاں پختہ مواد مہیا کریں۔ وہاں اقوامِ عالم کے سامنے اسلامی نظام کی برکات و تصوّرات بھی رکھیں تاکہ پوری نوعِ انسانی اس بابرکت اور بامقصد نظام کو قبول کرلے۔

اب ہم حج کے بارے میں حکیم الامّت علاّمہ محمد اقبالؒ کے نظریات پیش کرتے ہیں ۔

فرد می گردد زملّت احترام　　　ملّت از افراد می یابد نظام

ملّتے را رفت چوں آئیں زدست　　　مثلِ خاک اجزائے او از ہم شکست

علاّمہ اقبالؒ رموزِ بیخودی میں لکھتے ہیں :۔

" درمعنی ایں کہ حیاتِ ملیّہ مرکزِ محسوس می خواہد و مرکزِ اسلامیہ بیت الحرام است "　　　ص ۱۳۳

قوم را ربط و نظام از مرکزے　　　روزگارش را دوام از مرکزے
راز دار و رازِ ما بیت الحرم　　　سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرم
تو ز پیوندِ حریمے زندہ　　　تا طوافِ او کنی پائندہ
درجہاں جانِ اُمم جمعیّت است　　　درنگر سِرِّ حرم جمعیت است　　　ص ۱۳۵

پیرہن را جامۂ احرام کُن　　　صبح پیدا از غبارِ شام کُن
مثلِ آباء غرق اندر سجدہ شو　　　آنچناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو　　　ص ۱۳۶

علم و دولت نظم کارِ ملّت است　　　علم و دولت اعتبارِ ملّت است　　　ص ۱۸۹
خودی تعمیر کن در پیکرِ خویش　　　چو ابراہیم معمارِ حرم شو　　　ص ۲۵
خرد اندر سرم بت خانہ ریخت　　　خلیلِ عشق دیرم را حرم کرد　　　"
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است　　　کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم　　　ص ۲۲۲
غلامِ ہمّتِ آں خود پرستم　　　کہ با نورِ خودی بیند خدا را　　　ص ۲۳۷
ہر مُلک مُلکِ ماست کہ مُلکِ خدائے ماست　　　ص ۲۹۹
درِ بت خانہ زدم، مغ بچگانم گفتند　　　آتشے در حرم افروز و تپیدن آموز

حضرت علاّمہ نے کتنے پتے کی بات کہی ہے جو مغ بچگان کی زبان سے ہے۔

I　آتش در حرم افروز
II　تپیدن آموز

یہی درس ہمیں دنیا بھر کی انجمنیں دے رہی ہیں ۔ سیٹو ۔ نیٹو ۔ سارک ۔ افریشیائی بلاک ۔ تیسری دنیا

غیر جانبدار ممالک وغیرہ وغیرہ

آتشے در حرم افروز
تپیدن آموز

آیئے ہم اپنے گھر کی خبر لیں۔

ہمارا اللہ ایک
ہمارا بیت اللہ ایک
ہمارا قرآن ایک
ہمارا آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک

ے "کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک"

اس اہم تصوّر کو اقبال انتہائی دَرد و گداز میں یوں پیش فرماتے ہیں

درجہاں بال و پرِ خویش کشودن آموز
کہ پریدن نتواں با پر و بالِ دیگراں (کلیات اقبال فارسی ص ۲۴۲)

طوافِ کعبہ زدی گرد دیر گردیدی نگاہ بخویش نہ پیچیدہ دریغ از تو (ص ۳۵۴)

یہ ہے بال و پرِ خویش کی اہمیّت! ہمارے بال و پر کہاں ہیں؟ - وہ مسلم تہذیب میں بیت اللہ۔ قرآنِ کریم کا بار بار تذکرہ کرنے والوں اور بے عملی کا مظاہرہ کرنے والوں سے وہ کہتے ہیں۔

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری عجب ایں است کہ بیمار تو بیمار تر است (ص ۳۵۸)

سوال یہ نہیں بیت اللہ شریف اور قرآنِ کریم کی اہمیت کچھ کم ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے بھی یہ لامرکزیّت اور لاقانونیت کیوں ہے؟ اگر ہم اس مرکز اور قانون کو اپنا لیں تو بات یوں بنے۔

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی ص ۴۰۰

کرۂ ارض پر یہ "نقشِ دگر" یوں ہی بن سکتا ہے کہ اقوامِ متحدہ کی جگہ وحدتِ آدم کے طور پر مسلمانوں کی عالمی وحدت "حج" کو علمی، سیاسی، تہذیبی، تسخیری فوجی اور تمام دیگر ذرائع سے یکجا کرنے کی بھرپور کوششوں کا آغاز کیا جائے۔

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

اس کے برعکس آج حج کے نام پر جو کچھ ہم کر رہے ہیں کتنا بے ثمر اور کتنا بے اثر ہے۔

سوال ۱۳: مسلم، مومن، کافر اور منافق کی قرآن کریم کے مطابق کیا درجہ بندی ہے اور یہ کہ موجودہ ملّتِ اسلامیہ کے افرادِ معاشرہ کی اکثریت (الا ماشاء اللہ) کس زمرہ میں آتی ہے؟

جواب: اسلام اور مسلم کی تفصیل (الدّین) سوال ۱ کے جواب میں پیش کی جاچکی ہے۔ اسے وہاں بھی دیکھ لیا جائے۔

اسلام مذہب نہیں "الدّین" ہے۔

مذہب انسانی شخصیّت سے وابستہ ہوکر رہ جاتا ہے جب کہ دینؔ (اسلام) خدا تک براہِ راست روابط پیدا کرا دیتا ہے۔ دین کی آخری کتاب "قرآنِ کریم" ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۹)

فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا (۳/۲۰)

.... وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ (۳/۸۴)

اور اسلام کا یہ معیار مسلم معاشرہ میں یوں رائج ہوتا ہے

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَکُمْ وَ اِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ (۹ / ۲۳)

جس معاشرہ میں قوانینِ خداوندی کے معیار کے طور پر ماں باپ اور بھائیوں کو دوست نہ بنایا جاسکے وہاں خلوص، عشق، محبّت اور یکتائیت ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بلند و بالا ہوجاتی ہے۔ یہ ہے مسلم کا معیار۔ اس معیار کو دوہری شخصیّت سے متاثر نہیں کیا جاسکتا۔

وَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ اِنَّھُمْ لَمِنْکُمْ ؕ وَ مَا ھُمْ مِّنْکُمْ وَلٰکِنَّھُمْ قَوْمٌ یَّفْرَقُوْنَ (۹/۵۶)

اگر وہ قسم اٹھا کر کہیں کہ وہ تم میں سے ہیں تو کیا فرق پڑسکتا ہے ان کا عمل بتا رہا ہے کہ وہ تفریق پیدا کرنے والے ہیں۔ لہٰذا وہ تم میں سے نہیں ہیں۔

منافق: یہاں سے منافقت کی ابتدا ہوتی ہے۔ دوہری شخصیّت والے ہر دو معاشروں سے تعلّق رکھنا چاہتے ہیں۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ تفریق پیدا کرنے والے کے اعمال اور دوہری شخصیّت رکھنا اس کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی۔

کی کوئی گنجائش نہیں مل سکتی۔

یہاں تو ایمان کے بعد خود سپردگی کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۲/۱۶۵)

ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے حُب رکھتے ہیں۔ جب اس حُب میں ذرّہ بھر کوئی غیر اللہ شریک ہو گیا منافقت راہ پاگئی جس سے اعمال متاثر ہوتے ہیں۔ تفریق بین المسلمین کا آغاز ہو جاتا ہے اور جو اعلانیہ اس معاشرہ کے خلاف ہوتے ہیں۔ ان کو اس نئے گروہ (منافقین) سے کافی معلومات اور سہارا ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ گویا منافق مسلم معاشرہ کیلئے دیمک اور کافر کیلئے سیڑھی مہیا کرنے والے عناصر کا گروہ ہے۔

کافر

اب ہم کافر کی طرف آتے ہیں۔ یہ گروہ اس لحاظ سے کافی بہتر ہے کہ ظاہر ہو کر سامنے آتا ہے۔ چھپ کر حملہ نہیں کرتا۔ وہ انسانی ذات خودی۔ اَنَا (PERSONALITY) کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ جسم کی موت سے یہ سارا کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ وہ خدا، اللہ، وحی اور حیاتِ آخرت کو کچھ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہی دنیا کی زندگی ہے اور بس۔ اسی لئے وہ

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۱۰۰/۸)

وہ اس دنیا کی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے "حبّ الخیر" میں غرق ہو جاتا ہے اور عقل انسانی کے بل بوتے پر زندگی بسر کرتا ہے۔ روس اور اہل مغرب کا معاشرہ اسی نوع کا کھلا ہوا۔ ظاہر بے پردہ اور اعلانیہ کافرانہ معاشرہ ہے۔ اگر ہمارے معاشرے میں بھی اس کی حمایت جاری ہے۔ تو ایسے لوگوں کو پہچاننا ان کو نگاہ میں رکھنا۔ ان کو قرآن کی طرف پرخلوص دعوت دینا ہمارا فریضہ ہے۔ ورنہ ایسے لوگ قلّت سے کثرت اختیار کر کے ہمارے لئے مصیبت بن سکتے ہیں۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کافر اور منافق کو ایک خاص معیار کے ساتھ پہچان کر ان سے تعلقات میں احتیاط اختیار کی جائے

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو قرآن کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

لہٰذا مسلم معاشرہ کا قرآن کے مطابق حکومت قائم کرنا ترجیحات کا تعین کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس تذبذب میں ہم ۴۲ سال ضائع کر چکے ہیں۔ پرانی نسل ختم ہو چکی ہے۔ باقیات میں کم از کم ہیں۔

جن کے دِل میں پاکستان اور قرآن کی محبت ہے۔ ان کیلئے کڑی آزمائش کا وقت ہے۔ ورنہ ہمارا شمار یقیناً مسلم کے معیار سے گرتا رہے گا اور اگر ہم سنبھل نہ سکے تو عذابِ خداوندی میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اُس وقت ہمیں یہ خود ساختہ لیبل (مومن، مسلمان) نہ بچا سکیں گے۔

جو بھی کرنا ہے کر زندگی کے لئے
وقت رُکتا نہیں ہے کسی کے لئے (مظفر وارثی)

(۲) مسلمانوں کے اعمال کیلئے ضوابط و قوانین کا معیار یکساں ہوتا ہے۔ اس میں دوہری شخصیت راہ نہیں پا سکتی۔ کیونکہ یہ منافقت ہوتی ہے۔

جاتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کیساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہرو کو میں! (اقبالؒ)

(۳) توحید کس طرح انفرادیت سے وابستہ ہے اس بارے میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

ے یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ع ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت

اب ہم اس اہم سوال کی طرف آتے ہیں کہ ہم پاکستانی مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے اور ہم (کافر مومن، مسلم، منافق) کس زمرے میں آتے ہیں۔

جو خود مسلمان رہنا چاہتا ہے اگر اس کو "رام سنگھ" کے نام سے پکارا جائے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے وہ آگ بگولا ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہماری مسلمانی میں کم علمی کی وجہ سے محرومیاں اور ناکامیاں ہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آجاتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف کافر و منافق کے فتوے لگائیں۔ بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ پاکستان میں قرآن کے مطابق حکومت قائم کرنے کی طرف پیش رفت جاری رکھیں جو کوئی اس راہ میں حائل ہو اس کے خلاف فتویٰ بازی یا قانونی کاروائی کا جواز پیدا ہو سکتا ہے

منافقت کا بیج اس وقت بویا گیا تھا۔ جب ہمارے ہاں حکومت کی وہ مغلیہ باگ ڈور ختم ہو گئی اور مسلمانوں نے انگریزوں سے تعلقات استوار کرنے شروع کئے۔ انگریزی دَور کا حکمران طبقہ تسلسل سے آج تک رواں دَواں ہے۔ یہ طبقہ اہلِ حلم۔ اہلِ مساجد سے کم اور حکمرانوں سے زیادہ تعلقات رکھنا چاہتا ہے۔

ان کی اصلاح کیلئے کاروائی ضروری ہے اور اس طبقہ کا مالی احتساب بھی کیا جانا چاہیئے۔ اگر وہ قرآنی اخلاق اپنا کر پاکستانی بن جائے۔ انسانی بنیادی حقوق کا احترام کرے تو بہتر۔ ورنہ اس نسل در نسل سرایت کرنیوالے منافقانہ اثرات کا گہرے آپریشن سے صفایا کیا جائے اور کچھ عرصہ ان کو اقتدار سے دُور رکھا جائے اس طرح ہمارے معاشرے سے منافقت کا خاتمہ ہو سکے گا۔

- اسی طبقہ نے رشوت کو رواج دیا ہے اور حرام خوری جائز بن رہی ہے۔
- انتظامیہ سے تعلّقات رکھنے والے ۴۲ سالہ دَور کا مالی احتساب کیا جائے اور ان کی ناجائز کمائی سے پردہ اٹھایا جائے تاکہ ان کے اعمال اور سیاہ کارناموں سے قوم کو آگاہی ہو۔
- ملک کے غریب طبقہ ہاریوں۔ مزارعین اور مزدوروں سے تعلقات قائم کر کے ان کے دکھوں کی تاریخ معلوم کی جائے کہ کب اور کس کس نے ان پر ظلم و ستم کیا ہے اس سے بھی مجرم افراد کا سراغ مل سکے گا۔

گویا

ہمیں کافر اور منافق قرار دینے کی جنگ کے برعکس اپنے ملک میں ان افراد کے کردار کا جائزہ لینا چاہیئے جو انگریز کے وفادار رہے اس طرح انتظامیہ میں شامل ہونے کے اہل بنے اور آج تک انتظامیہ کی طرف سے کی جانے والی تمام زیادتیوں کے ذمّہ دار ہیں۔ ان کے بینک بیلنس۔ جاگیریں۔ جائدادیں۔ پلانے مارکیٹیں سب احتساب کی زد میں آنے چاہئیں ورنہ محض کسی کو کافر اور منافق قرار دینا کچھ معنی نہیں رکھتا۔

ہاں

اس طبقہ کا یہ بھی کردار ہے۔ وہ پلازے بنا کر مقامی مسجد میں دری بچھا کر شرفاء کی صف میں بھی شامل رہنا چاہتا ہے اس طرح وہ تعلقات کے لحاظ سے بچ سکتا ہے لیکن یہاں بات تعلقات کی نہ ہونی چاہیئے بلکہ صرف معاشی احتساب کی ہونی چاہیئے اور بس!

خواجہ ازہر عباس

اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ط

وحی صرف قرآن میں ہے

(خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے)

چونکہ عقلِ انسانی مسائلِ حیات کا صحیح حل پیش کرنے سے قاصر ہے اس لئے خدا تعالےٰ نے اپنی رحمتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کے باعث نوعِ انسان کی مسلسل رہنمائی فرمائی اور متواتر، پے در پے، انبیاء کرام مبعوث فرمائے تاکہ ان کے توسط سے انسان کو ہدایتِ خداوندی حاصل ہوتی رہے۔ تمام انبیاء کرامؑ کو وحیِ الٰہی سے نوازا گیا اور جب سلسلہ بعثتِ انبیاء کرام منقطع کیا گیا تو آخری وحی کو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی۔

وحی الٰہی صرف قرآنِ کریم میں محفوظ ہے۔ خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے۔ امتِ مسلمہ کی بدقسمتی کا وہ پہلا دن تھا جس دن یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ کچھ وحی قرآن کے اندر ہے اور کچھ وحی قرآن کے باہر۔ یہ عقیدہ اپنے نظریات کو JUSTIFY کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا اور اس نے مسلمانوں میں ایک مستقل عقیدہ کی شکل اختیار کر لی اور ان کی تباہی کا باعث بنا۔ اس سے ایک ایسا چور دروازہ کھل گیا کہ ہر عقیدہ کو وحیِ الٰہی قرار دے کر حضورؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا لیکن قرآنِ کریم سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ قرآنِ عزیز سے یہی واضح ہوتا ہے کہ وحیِ الٰہی صرف اور صرف قرآنِ کریم میں محفوظ ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کی تائید میں قرآنی دلائل اور اس کے بعد عقلی دلائل پیش کئے جائیں گے۔ آخر میں ان الزامی جوابات اور اشکالات کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی جو علمائے کرام کی طرف سے وحی کو صرف قرآنِ کریم میں محفوظ ماننے پر وارد کئے جاتے ہیں۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

وحی صرف قرآن میں ہونے کے دس دلائل

(۱) موحی (خدا تعالےٰ) کا ارشادِ گرامی ہے کہ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ هٰذَ الْقُرْاٰنَ اور

موحی الیہ (حضورؐ) کا ارشاد ہے۔ اُوحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰن (۶/۱۰)۔ ھٰذا کا اسمِ اشارہ ساتھ لانے سے حصر کر دیا گیا کہ یہی قرآن ہم نے نازل کیا اور یہی قرآن مجھ پر نازل کیا گیا۔ دونوں آیات سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کے علاوہ کسی چیز کو وحی کرنے کی خبر قرآن میں نہیں ہے۔

(۲) وَ اوحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَ مَنْ بَلَغَ (۶/۱۹) مجھ پر یہ قرآن نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اس کے ذریعے ڈراؤں اور ہر وہ شخص جس کے پاس یہ پہنچے وہ بھی اس کے ذریعہ ڈرائے۔

قُلْ اِنَّمَا اُنْذِرُکُمْ بِالْوَحْیِ ۔ کہدو۔ بجز ایں نیست کہ میں تمہیں وحی کے ذریعہ ڈراتا ہوں۔ پہلی آیت میں انذار بذریعہ قرآن فرمایا اور دوسری آیت میں انذار بذریعہ وحی۔ جس سے ثابت ہے کہ وحی قرآن کریم ہے۔ وحی اور قرآن کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ متبادل طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔ دونوں الفاظ ایک دوسرے کی جگہ SUBSTITUTE کر دیئے گئے ہیں۔

(۳) اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰکَ اللّٰہُ (۴/۱۰۵)
فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ۔ (۵/۱۰۸)۔

پہلی آیت کریمہ میں حکم ہے کہ ہم نے تیری طرف کتاب نازل کی تاکہ تو لوگوں کے درمیان حکومت کرے یا فیصلے کرے۔ بذریعہ اس علم کے جو تجھے قرآنِ کریم سے حاصل ہوا۔ دوسری آیت مجیدہ میں حکم ہے کہ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ کے مطابق فیصلہ کر۔ دونوں آیاتِ کریمات اور بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ ایک ہی چیز کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متبادل استعمال کئے گئے ہیں جس سے ثابت ہے کہ کتاب اور بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ ایک ہی چیز ہے۔

مَا یُوْحٰی اِلَیْکَ اور قرآن ایک دوسرے کے متبادل استعمال کئے گئے ہیں

(۴) فَلَعَلَّکَ تَارِکٌ بَعْضَ مَا یُوْحٰی اِلَیْکَ وَ ضَآئِقٌ بِہٖ صَدْرُکَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْہِ کَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَہٗ مَلَکٌ ، اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِیْرٌ ۔ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ ۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىہُ ، قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِہٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔ (۱۱/۱۲)

ترجمہ: جو چیز تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی ہے ان میں سے بعض کو شاید تم فقط اس خیال سے چھوڑ دینے والے ہو اور تم تنگ دل ہوتے ہو کہ مبادا یہ لوگ کہہ بیٹھیں کہ ان پر خزانہ کیوں نہیں نازل کیا گیا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا۔ تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور خدا ہر چیز کا ذمہ دار ہے

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے (قرآن) اپنی طرف سے گڑھ لیا ہے تو تم کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو ایسی دس سورتیں بنالاؤ اور خدا کے سوائے جس جس کو تم بلا سکو مدد کے لئے بلالو۔ (از ترجمہ :۔ شاہ عبدالقادر مرحوم)

وَ مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تفصل الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا من اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (۱۰/۳۷)

ترجمہ: اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اپنی طرف سے جھوٹ موٹ بنالے بلکہ یہ تو جو کتابیں پہلے کی اس کے سامنے موجود ہیں اس کی تصدیق اور ان کتابوں کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سارے جہان کے پروردگار کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو رسول نے جھوٹ موٹ بنالیا ہے۔ اے رسول تم کہو کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ایک ہی سورت اس کے برابر کی بنالاؤ اور خدا کے علاوہ جسے چاہو بلالو۔

پہلی آیت میں افتریٰ کا الزام مَایُوحیٰ کے لئے ہے۔ دوسری آیت میں افتریٰ کا الزام قرآنِ کریم کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں مَا یُوحیٰ اِلَیْكَ کے لئے تحدّی کی گئی ہے کہ اس کے مقابلہ کی دس سورتیں بنالاؤ۔ دوسری آیت میں قرآنِ کریم کے لئے چیلنج کی گئی ہے کہ قرآنِ کریم جیسی کوئی سورۃ بنالاؤ۔ دونوں آیات کے ساتھ پڑھنے سے نتیجہ بالکل واضح ہے کہ مَایُوحیٰ صرف قرآنِ کریم ہے۔ علاوہ ازیں دونوں آیات کے الفاظ تک ایک جیسے ہیں۔ صرف اتنا فرق ہے کہ جس چیز کو پہلی آیت شریفہ میں مَایُوحیٰ کہا گیا ہے۔ اسی کو دوسری آیت میں قرآن کہا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ وحی صرف قرآنِ عزیز میں ہے۔ دونوں الفاظ کو ایک دوسرے کے متبادل استعمال کیا گیا ہے۔

وحی صرف متلو ہے

(۵) ہمارے ہاں عقیدہ کے طور پر وحی کو دو قسموں میں منقسم کیا ہوا ہے۔ ایک وحی متلو، جو قرآنِ کریم میں محفوظ ہے اور دوسری وحی غیر متلو، جو قرآن کے باہر ہے۔ ان کے لئے وحی جلی اور وحی خفی کے الفاظ بھی علی الترتیب استعمال کئے جاتے ہیں۔ مگر قرآنِ کریم کا ارشاد ہے۔ وحی ساری کی ساری صرف متلو ہے۔ لہٰذا قرآن کے اندر محفوظ۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ۔ (۱۳/۳۳)۔

ترجمہ:۔ اے رسول! اسی طرح ہم نے تم کو اس امت میں بھیجا ہے جس سے پہلے اور بہت سی امتیں گزر چکی ہیں تاکہ تم ان کے سامنے اس کی تلاوت کرو جو ہم نے تمہیں وحی کیا ہے۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ مطلق مَا يُوْحٰى متلو ہے جس کی تلاوت حضورؐ فرمایا کرتے تھے اور وحی ساری متلو ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ غیر متلو وحی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

امت صرف قرآن کی وارث ہے وحی خارج از قرآن کی وارث نہیں

(۶) وَ الَّذِيْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ (۳۵/۳۵)۔

اور ہم نے جو کتاب تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی وہ بالکل ٹھیک ہے اور جو (کتابیں اس سے پہلے کی) اس کے سامنے ہیں ان کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ بے شک خدا اپنے بندوں سے خوب واقف ہے اور دیکھ رہا ہے۔ پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے خاص ان کو کتاب کا وارث بنایا جنہیں ہم نے منتخب کیا۔

اس آیت میں مِنْ بیانیہ ہے اور کسی صورت میں تبعیضیہ نہیں بن سکتا کیونکہ اگر تبعیضیہ قرار دیا جائے تو اس کے معنے ہوں گے کہ قرآن کا بعض حصہ حق ہے اور بعض باطل۔ لیکن چونکہ یہ بات نہیں ہے اس لئے یہاں مِنْ بیانیہ ہی لیا جا سکتا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ وحی کیا گیا ہے وہ کتاب ہے۔

نیز یہ کہ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ سے مزید وضاحت کی گئی ہے کہ وحی صرف کتاب ہے جس کا وارث امتِ مسلمہ کو قرار دیا گیا ہے۔ امتِ مسلمہ صرف کتاب کی وارث ہے اور وحی قرآنِ کریم کے علاوہ بھی ہوتی تو امتِ مسلمہ اس کی بھی وارث قرار پاتی۔ یہ آیتِ کریمہ ایسی برہانِ قاطع ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ امتِ مسلمہ صرف قرآن کی وارث ہے اور اس کے اتباع کی مکلف۔

مَا يُوْحٰى اور قرآن ایک ہی چیز ہے

(۷) وَ اتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ

اور پڑھ جو کچھ وحی کی گئی ہے طرف تیری کتاب پروردگار تیرے سے نہیں کوئی بدلنے والا

باتوں اس کی کو۔ (شاہ عبدالقادر)

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا وَ لَهٗ كُلُّ شَیْءٍ وَّ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ۔ (۲۷/۹۲)۔

سوائے اس کے نہیں کہ حکم کیا گیا ہوں میں کہ عبادت کروں پروردگار اس شہر کے کو جس نے حرمت دی اس کو اور واسطے اسی کے ہے ہر چیز۔ اور حکم کیا گیا ہوں میں یہ کہ ہوں میں مسلمانوں سے اور یہ کہ پڑھوں میں قرآن۔

پہلی آیت میں مَا اُوْحِیَ کی تلاوت کا حکم ہے اور دوسری آیت میں قرآن کریم کی تلاوت کا حکم ہے جس سے ظاہر ہے کہ مَا اُوْحِیَ اور قرآن کریم ایک چیز ہے اور دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متبادل استعمال کئے گئے ہیں اور مَا اُوْحِیَ صرف قرآن ہے نیز یہ کہ پہلی آیت میں مِنْ بیانیہ ہے۔ تبعیضیہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

کتاب اور مَا اُنْزِلَ ایک ہی چیز ہے

(۸) هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

اور یہ کتاب ہے اتاری ہم نے اس کو برکت والی، پس پیروی کرو اس کی اور پرہیزگاری کرو تاکہ رحم کئے جاؤ۔

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ۔

پیروی کرو اس چیز کی کہ اتاری گئی ہے تمہاری طرف پروردگار تمہارے سے اور مت پیروی کرو سوائے اس کے دوستوں کی۔

پہلی آیت میں کتاب کے اتباع کا حکم ہے اور دوسری آیت میں مَا اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ کے اتباع کا حکم ہے۔ صرف الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ رکھا گیا ہے جس سے ثابت ہے کہ مَا اُنْزِلَ صرف کتاب ہے۔

نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ قرآن ہے

(۹) وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ۔ (۴۷/۲)

اور جو لوگ کہ ایمان لائے اور کام اچھے کئے اور ایمان لائے اس چیز کے ساتھ کہ اتاری گئی محمدؐ کے اوپر اور وہ حق ہے پروردگار ان کے سے۔ دُور کیں ان سے برائیاں ان کی اور سنوارا حال ان کا۔

یہاں نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری آیت میں قرآنِ کریم ہی کو وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ فرمایا ہے جس سے ظاہر ہے کہ نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ، تنزیل یعنی قرآنِ کریم ہے۔

معارضہ مِمَّا نَزَّلْنَا کا کیا گیا ہے صرف قرآن کا نہیں

(۱۰) وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔

اس آیت میں معارضہ مِمَّا نَزَّلْنَا کا کیا گیا ہے صرف قرآن کا نہیں۔ یہاں یہ بات بڑی غور طلب ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز بھی منزل من اللہ ہوتی تو اس کے مقابلہ کی تحدّی بھی پیش کی جاتی اور ارشاد ہوتا کہ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ اَوْ بِحَدِيْثٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ لیکن یہاں مِمَّا نَزَّلْنَا (مُنَزَّلٌ مِّنَ اللّٰهِ) کو صرف سورتوں پر مشتمل قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ اس آیتِ کریمہ میں مُنَزَّلٌ مِّنَ اللّٰهِ کا (CRITERON) محک و میزان نکھار کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے کہ منزل من اللہ صرف وہ ہے جس کا مثل نہ بن سکتا ہو۔ اب اس معیار کے مطابق صرف قرآنِ کریم ہی وہ کتاب ہے جس کا مثل آج تک نہیں بن سکا۔ ورنہ احادیثِ مبارکہ کا مثل تو اس قدر کثیر تعداد میں ہے کہ اس کی صحت و سُقم جانچنے کے لئے مستقل ایک علم کی ضرورت درکار ہوتی ہے اور اس کے باوجود آجتک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ صحیح احادیثِ مبارکہ کون سی ہیں اور غلط کونسی۔

اختصار کے پیشِ نظر یہ دس دلائل قاطعہ اور براہینِ ساطعہ قرآنِ کریم سے پیش کئے گئے ہیں۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔ ورنہ قرآنِ کریم کی دیگر آیات سے بھی اس موقف کے حق میں استدلال کیا جا سکتا ہے اگر پہلے سے ذہن میں وحی غیر متلوّ کا عقیدہ ذہن میں نہ بٹھایا جائے اور خالی الذہن ہو کر قرآنِ کریم کا مطالعہ کیا جائے تو کسی آیت سے بھی وحی غیر متلوّ کا خیال تک نہیں آ سکتا۔

وحی صرف قرآن میں ہونے کی عقلی دلیل

عقلاً بھی یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کہ وحی قرآنِ کریم کے باہر بھی تھی کیونکہ اگر قرآنِ کریم کے باہر بھی وحی تھی تو حضورؐ کا فرضِ منصبی تھا کہ وہ نہ صرف اس کی واضح طور پر نشاندہی فرماتے بلکہ اس کی حفاظت کی تلقین بھی فرماتے کیونکہ حضورؐ کا فرض اصلی ہی تبلیغِ وحی تھا۔ قرآنِ کریم کو محفوظ کیا گیا۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا تعالےٰ نے اپنے ذمہ لی۔ اگر وحی قرآن سے باہر تھی تو اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خدا تعالےٰ

پر ہوتی اور اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ میں ذکر کے ساتھ اس کا بھی اندراج ہوتا۔
لیکن صورت یہ ہوئی کہ حضورؐ کے اڑھائی سو سال بعد حدیث کی تدوین کی گئی اور مختلف آئمہ کرام نے اس کو جمع کیا۔
اگر حدیث وحی ہے اور وہ اُن آئمہ حدیث کی کوششوں سے جمع کی گئی ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نصف وحی
تو خدا نے محفوظ رکھی اور باقی نصف وحی ان حضرات کی کوششوں سے محفوظ رہ سکی اور اس طرح یہ حضرات
شریکِ کارِ رسالت قرار پائے۔ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وحی جیسی اہم چیز کو حضورؐ دوسروں کی کوششوں پر چھوڑ
جاتے۔ پھر احادیث جمع کرنے کے جو کوائف خود کتبِ حدیث میں مذکور ہیں ان سے ظاہر ہے کہ امام بخاریؒ
نے تقریباً چھ لاکھ احادیث میں سے صرف چھ ہزار احادیث اپنی صحیح میں جمع فرمائی ہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں
کہ وحی کے جمع و استرداد کا حق امام صاحب موصوف نے استعمال فرمایا۔ معلوم نہیں امام صاحب کے پاس
وہ کونسا ذریعہ تھا جس کے سبب انھوں نے اتنی بڑی تعداد احادیث کی مسترد فرمادی۔ آج کے مزعومہ
منکرینِ حدیث تو چند ہزاری احادیث کے منکر ہیں۔ امام صاحب موصوف رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے اتنی بڑی تعداد
احادیث کا انکار فرمایا اور منکرِ حدیث کے الزام سے محفوظ رہے۔ یہ بات وحی کی توہین و استخفاف ہے
کہ اس کے قبول و استرداد کا حق کسی کو بھی دیا جائے خواہ وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو۔

وحی خارج از قرآن کا اقرار بھی اور انکار بھی

یہ عجیب بات ہے کہ جملہ اہلِ اسلام کے مختلف فِرق سب کے سب موجودہ
ذخیرۂ احادیث کا اقرار بھی کرتے ہیں اور انکار بھی کرتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ مسلمانوں میں جتنے فرق بھی ہیں
ان میں اہلِ تشیع اور اہلِ سنن کی تو احادیث کی کتب ہی مختلف ہیں۔ شیعہ حضرات کی کتب اربعہ ہیں اور اہل
سنت کی صحاح ستہ۔ اس طرح ایک طرف چھ صحاح صحیح اور چار کُتب غلط ہیں اور دوسری طرف چار صحیح اور چھ غلط
ہیں۔ اور عملاً یہ پوزیشن ہے کہ سُنّی، شیعوں کی کتب کا انکار کرتے ہیں اور شیعہ سُنیّوں کی کتب کی تغلیط کرتے
ہیں۔ اس طرح دونوں طرف اقرار بھی ہے اور انکار بھی۔ اسی طرح اہلِ حدیث حضرات فاتحہ خلف الامام،
رفع یدین، رفع سبابہ، آمین بالجہر کی احادیث کو درست قرار دیتے ہیں۔ مگر اہلِ تقلید حضرات ان احادیث کا
انکار کرتے ہیں۔

حنفی حضرات میں بھی بریلوی حضرات ایصالِ ثواب، سماعِ موتیٰ، استمداد غیر اللہ کو SUPPORT کرنے
والی احادیث کو درست خیال کرتے ہیں اور دیوبندی حضرات ان کو غلط شمار کرتے ہیں۔ غرض پورے مسلمانوں
میں یہی صورتِ حال ہے کہ اقرار بھی ہے اور انکار بھی۔ وحیِ الٰہی اس سطح سے بلند ہوتی ہے۔ اس پر ایمان
لانا لازمی ہوتا ہے۔ اس پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مومن یا مسلمان نہیں ہو سکتا۔ وحیِ الٰہی اِن اعتراضات سے

بلند و بالا ہوتی ہے اور اس میں ظن و شک کا شائبہ تک نہیں پایا جا سکتا کیونکہ اگر ذرا بھی تشکیک و ظن کا پہلو موجود ہو تو اس پر ایمان مستحکم و مضبوط ہو ہی نہیں سکتا۔ وَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ۔

حضورؐ کا ہر قول وحی نہیں تھا

علماءِ کرام کی طرف سے جو دلائل وحی خارج از قرآن کے سلسلہ میں پیش کئے جاتے ہیں اُن میں سرفہرست یہ اعتراض ہے کہ چونکہ نطقِ رسول وحی ہے اس لئے حضورؐ کا ہر قول وحی ہے۔ لہٰذا، حضورؐ کی احادیث وحی ہیں۔ اس نظریہ کی تائید میں آیۂ کریمہ وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى الخ ہر موقعہ پر پیش کی جاتی ہے۔ چنانچہ علامہ محمد ایوب صاحب نے اپنی کتاب "فتنۂ انکارِ حدیث" میں تحریر فرمایا "بے شمار دلیلیں موجود ہیں قرآن کے علاوہ دوسری وحی پر "مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا۔ اس کا نطق صرف وحی ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف قرآن اپنی خواہش سے نہیں بولتا تو یہ غلط ہے۔ اس لئے کہ قرآن کو آیت میں محذوف ماننا پڑے گا اور حذف خلافِ اصل ہے۔ دوسرے ھو کی ضمیر کا مرجع اوپر مذکور نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ وہ سیدھے راستے سے رُکا اور نہ ٹیڑھا چلا۔ عمل کی صفائی مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوٰى سے کر دی اور قول کی صفائی مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى سے کر دی یعنی اس کا قول و فعل من جانب اللہ ہے۔ اس کے علاوہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ مطلقاً نطقِ ہوائی کی نفی ہے۔ لہٰذا، اس کا ہر قول غیر ہوائی اور وحی ہے۔"

عموماً یہی دلیل سرفہرست ہوتی ہے۔ لیکن یہ اعتراض آیت مبارکہ کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ حضورؐ کے ہر نطق کے وحی ہونے کے خلاف خود قرآن اور روایات میں دلائل موجود ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ ایک لڑائی میں حضورؐ نے منافقوں کو شرکت نہ کرنے کی اجازت عنایت فرما دی تھی، تو اسی پر یہ آیت لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى تَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ نازل ہوئی کہ آپ نے انہیں اجازت کیوں دے دی۔ یعنی خدا تعالےٰ نے حضورؐ کے قول کو APPROVE نہیں فرمایا۔ اب اگر آپ کا اجازت دینا وحی الٰہی سے تھا تو پھر خدا تعالےٰ نے خود اجازت دلوانے کے بعد حضورؐ کے اس قول کی تصویب کیوں نہیں فرمائی۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ کا اجازت دینا وحی نہیں تھا بلکہ یہ آپ کا اپنا بشری قول تھا۔

اسی طرح سورۂ مجادلہ کی پہلی آیتِ کریمہ کے ذیل میں تمام مفسرین نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت خویلہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کو ان کے شوہر حضرت اوس بن صامت رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ظہار کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب انہیں خواہش ہوئی تو ظہار کے متعلق صحیح پوزیشن حاصل کرنے کا تردد ہوا۔ اس پر حضرت خویلہ بنت ثعلب حضورؐ کے

پاس آئیں اور اصرار کیا کہ ظہار سے طلاق واقع نہیں ہوئی مگر حضورؐ بار بار یہی فرماتے رہے کہ ظہار کرنے کی وجہ سے طلاق ہوگئی۔ چنانچہ حضرت خویلہ حضورؐ سے اس بات پر جھگڑتی رہیں مگر حضورؐ کہ جن کی ہر بات علماء کے نزدیک وحی تھی بار بار یہی فرماتے رہے کہ نہیں تمہیں طلاق ہوئی۔ مگر فوراً وحی میں یہ دو آیات نازل ہوئیں اور اس قرآنی وحی کے ذریعہ حضورؐ نے اپنی غیر قرآنی وحی یا وحیٔ خفی کو مسترد کر دیا۔ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْ إِلَى اللّٰهِ۔ کیا خدا تعالیٰ کو زیب دیتا ہے کہ اس کی ایک وحی دوسری وحی کی تردید کردے ـــــ می نہ سزد خدائے را۔

سورۂ تحریم کی پہلی آیتِ مبارکہ کے متعلق روایات میں بہت تفصیل سے کام لیا گیا ہے جس کا مکمل تحریر کرنا مشکل ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی ازواج مطہرات کی خوشنودی کی خاطر اپنے لئے مغافیر حرام قرار دے لئے تھے۔ چنانچہ آیتِ کریمہ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ الخ نازل ہوئی جس میں حضورؐ کے اس فعل کو مناسب قرار نہیں دیا گیا کہ آپ اپنی ازواج کی خوشنودی کے لئے وہ چیز کیوں حرام قرار دے لی جو اللہ نے آپ کے لئے حلال کی تھی۔ اس طرح پہلے تو اللہ تعالیٰ نے وحی خفی کے ذریعہ حضورؐ سے ان کی ازواج کی خوشنودی کی خاطر آپ پر شہد حرام کرا دیا پھر خود ہی وحیٔ جلی کے ذریعہ اسی قول کو ناپسند فرما دیا۔

نیز پہلے تو واقعہ اصحابِ کہف کے متعلق سوال کرنے والوں کے جواب میں حضورؐ سے خود ہی بذریعہ وحیٔ خفی کہلایا کہ میں اس کا جواب کل دوں گا اور اس کے بعد ہی آیتِ کریمہ وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا۔ نازل فرما کر وحیٔ جلی سے وحیٔ خفی کی تردید کرا دی۔

اختصار کے پیشِ نظر میں نے یہ چار آیاتِ کریمات، مع شانِ نزول و تراجم مرقوم کی ہیں جس سے ثابت کرنا ہے کہ حضورؐ کا ہر قول وحی نہیں ہوتا تھا۔ اگر آنجنابؐ کا ہر قول وحی تھا تو حضورؐ کے ان اقوال میں تخالف و تضاد واقع نہ ہوتا۔ صحیح صورتِ حال یہی ہے کہ وہ حضورؐ کے بشری اقوال ہوتے تھے۔ آپ بشر صاحبِ وحی تھے (۱۸/۱۱۰؛ ۴۱/۶)، نیز یہ کہ آپ بشر و رسول تھے (۱۷/۹۳) یعنی آپ بشر بھی تھے اور رسول بھی تھے اس لئے آپ کے بشری اقوال وحی نہیں تھے۔ مثلاً آپؐ فرماتے ہیں کہ آج موسم بہت گرم ہے میں آج بازار نہیں جاؤں گا یا آپ فرماتے کہ میں آج دوپہر کا وقت مسجد میں گزاروں گا وغیرہ، اقوال وحیٔ الٰہی نہیں تھے۔ یہ حضورؐ کے بشری اقوال تھے اور ان کو وحی قرار دینے کے معنے یہ ہیں کہ وحی کی اہمیت، اس کی عظمت اور اس کے شرف کا صحیح اندازہ نہیں کیا گیا۔ اس تمہید کے بعد سورۃ النجم کی آیات کا درست مفہوم

سورہ نجم کی پہلی آیات کا صحیح مفہوم

پیشِ خدمت کیا جاتا ہے۔ ان آیات میں ھُوَ کی ضمیر کی مرجع محذوف نہیں ہے بلکہ مظہر ہے۔ ھُوَ ضمیر کا مرجع النّجم یعنی ستارۂ ہدایت قرآنِ کریم ہے۔ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۵۳/۴)۔ ترجمہ (شہادت ہے قرآنِ کریم کی جب کہ وہ نازل ہوا کہ تمہارا یہ ساتھی نہ گمراہ ہوا ہے نہ بہک گیا ہے۔ وہ (وحی کے ضمن میں) بولتا ہے تو نہیں ہوتا وہ مگر وہی جو اس کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔ پس اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى میں ھُوَ ضمیر کا مرجع النّجم یعنی قرآنِ عزیز ہے۔

وحی صرف قرآن میں ہونے پر دوسرا اعتراض

اسی سلسلہ میں دوسرا اعتراض حضرات علماء کرام کی طرف سے اطاعتِ رسول میں سلسلہ میں کیا جاتا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ اگر وحی خارج از قرآن تسلیم نہ کی جائے اور احادیثِ مبارکہ جو کہ وحیٔ خفی ہیں، ان کی اطاعت نہ کی جائے تو اطاعتِ رسول کسی طور پر بھی نہیں کی جا سکتی اور یہ ظاہر ہے کہ

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

ان کے مؤقف کے مطابق قرآنِ کریم کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور حدیث کی اطاعت سے حضورؐ کی اطاعت ہوتی ہے لیکن یہ بات باعثِ تعجب ہے کہ جب قرآنِ کریم میں وحی ہے اور حدیث شریف بھی وحی ہے اور دونوں وحی شمار کی گئی ہیں تو ایک وحی کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے تو دوسری وحی کی اطاعت حضورؐ کی اطاعت کیسے ہو سکتی ہے۔ وحی تو نبی کو خارج سے ملتی ہے۔ وحی یکسر وہبی ہوتی ہے۔ وحی میں رسول کے جذبات کو مطلقاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر حدیث شریف وحی ہے تو اس کی اطاعت سے حضورؐ کی اطاعت کیسے ہو جائے گی۔ عقلاً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر وحی کی تقسیم وحی خفی و وحی جلی میں کی بھی جائے جو کہ بالکل غیر قرآنی تقسیم ہے، تب بھی وحیٔ خفی سے حضورؐ کی اطاعت نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی اطاعت رہتی ہے۔ اس لئے یہ نظریہ کہ چونکہ حضورؐ کی اطاعت حدیث کے ذریعہ ہوتی ہے اس لئے اس کا ماننا ضروری ہے۔ بداہتاً غلط ہے۔

اطاعتِ رسول کا صحیح طریقہ

اصل یہ ہے کہ اتباعِ وحی ہی اطاعتِ رسول ہے چنانچہ آیتِ کریمہ

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۗ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ:۔ بلاشبہ تمام لوگوں میں سے ابراہیمؑ کے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو اس کی اتباع کرتے ہیں اور یہ نبی اور ان کے ساتھی مومن بھی (ابراہیم کے بہت قریب

ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا مددگار ہے۔

سے واضح ہے کہ حضورؐ کو حضرت ابراہیمؑ کا قریب ترین شخص اس لئے بتایا گیا ہے کہ آپ ملتِ ابراہیم کے پیروکار تھے نیز صحابہ کرام کو بھی حضرت ابراہیمؑ کا اقرب کہا گیا ہے کیونکہ صحابہ حضورؐ کے متبع تھے اور حضورؐ حضرت ابراہیمؑ کے متبع تھے۔ اس طرح وہ صحابہ بھی ابراہیم علیہ السلام کے متبع تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حضورؐ کے پاس حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے موصول شدہ احادیث و روایات کا کوئی ذخیرہ موجود نہیں تھا کہ آپؐ احادیثِ ابراہیم کا اتباع کر کے حضرت ابراہیمؑ کے اقرب بنے ہوں۔ اس کی اصل صورت آیات نمبر ۶/۱۰۶، ۱۰/۱۰۹ سے واضح ہوتی ہے کہ چونکہ حضرت ابراہیم بھی وحی کے مطیع تھے اور حضورؐ بھی وحی کے متبع تھے۔ اسی لئے حضورؐ کا وحی کا اتباع بعینہٖ حضرت ابراہیمؑ کا اتباع تھا۔ اسی طرح صحابہ کا اتباع قرآن حضرت ابراہیمؑ کا اتباع تھا۔ نیز اسی توجیہہ سے یہ بات قابلِ تسلیم ہے کہ چونکہ حضورؐ خود قرآنِ کریم کے متبع تھے اس لئے قرآن کا اتباع کرنے سے ہی حضورؐ کا صحیح اتباع ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مَا یُوحٰی اور مَا اُنْزِلَ کا اتباع ہی انبیاء کا اتباع ہے اور جملہ انبیاء کی طرف مَا یُوحٰی اور مَا اُنْزِلَ صرف کتاب ہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ص وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ۔

کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور ان سب کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی کیونکہ جملہ انبیاء کرام کی وحی اور کتب کی تعلیم ایک ہی تھی اور ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس لئے جملہ انبیاء کرام ایک ہی تعلیم کے متبع تھے۔ پس ثابت ہوا کہ قرآنِ کریم کا اتباع ہی حضرت ابراہیمؑ سمیت جملہ انبیاءؑ کا اتباع ہے۔ اسی کی اتباع ملتِ ابراہیم یعنی ضابطۂ ابراہیم کی اتباع ہے۔ اسی (قرآن) کی اتباع اسوۂ ابراہیمی (۶۰/۴) کی اتباع ہے اور اسی کا اتباع اُسوۂ محمدی کا اتباع ہے (۳۳/۲۱)، جس کے لئے حدیث یا وحی خفی کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ و رسول کی اطاعت سے دو الگ الگ مطاعوں کی اطاعت تصور کرنا درست نہیں ہے۔ یعنی اللہ کا حکم الگ اور رسول کا حکم الگ۔ حالانکہ دو حاکم اور دو حکم ماننا قرآنِ کریم کی محکم آیات کے خلاف ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶/۵۷)، وَ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا (۱۸/۲۶)۔ ان آیات کے مطابق اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کا یہ ترجمہ "اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو" مطلقاً غلط ہے بلکہ اس میں واؤ کے معنے بذریعہ ہیں جیسے کہ

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ

الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝

بیزاری ہے اللہ کی بذریعے اپنے رسول کے ان لوگوں سے جن کے ساتھ تم نے مشرکوں سے عہد کیا تھا۔ (اور اعلان وفیصلہ ہے اللہ کا اپنے رسول کے ذریعہ کہ اے مشرکوں) تم زمین پر چار مہینے حرمت والے چل پھر لو۔ اور جان لو یہ کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور بے شک اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔

ان آیات میں مشرکوں کو اللہ اور رسول کی طرف سے الگ الگ مہلتیں نہیں دی گئیں بلکہ چار ماہ کی ایک مہلت ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ دی تھی۔

اسی طرح وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ الخ میں "و" بذریعہ کے معنے میں آئی ہے۔

ترجمہ:۔ "اعلان ہے اللہ کا اپنے رسول کے ذریعے حج اکبر کے دن کہ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعے مشرکوں سے بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔"

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالےٰ نے مشرکوں سے بیزاری کا اعلان اپنے رسول کے ذریعہ کرایا ہے جیسا کہ ظاہر ہے یہ اللہ اور رسول کے دو اعلان نہیں تھے بلکہ ایک ہی اعلان تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے کرایا تھا کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے۔ نیز

مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا۔ (۳۳/۱۲)۔

نہیں وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ نے بذریعے اپنے رسول کے مگر فریب دینے کو

میں بھی واؤ بمعنی بذریعے آیا ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ اپنے رسول کے ذریعہ ہی وعدہ فرماتا ہے خود آکر نہ کوئی وعدہ لیتا ہے اور نہ کوئی وعدہ دیتا ہے۔

اللہ اور رسول سے مراد مرکزِ ملّت ہے

اصل یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت دو مطاعوں کی اطاعت نہیں ہے اس لئے کہ جیسا کہ تین مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہے۔ یہ تصور قرآنِ کریم کی تعلیم کے منافی ہے کہ اطاعت اللہ کے سوا اور کسی کی بھی ہے حتیٰ کہ خود رسول کے متعلق بھی بتا دیا گیا ہے کہ اسے بھی حق حاصل نہیں کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ لہٰذا اللہ اور رسول سے مراد وہ مرکز دیں (CENTRAL AUTHORITY) ہے جہاں سے قرآنی احکام نافذ ہوں اور جہاں اللہ کی اطاعت رسول کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ یہ حقیقت کہ اللہ اور رسول سے مراد مرکزِ ملّت ہے۔ قرآنِ کریم میں اس قدر واضح کی گئی ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔

(۱) يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝ (۸/۲۰)

اے مومنو! تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی مت کرو درآنحالیکہ تم سُن رہے ہو۔

یہاں اللہ اور رسول دو کا ذکر ہے اور عنہ کی ضمیر واحد ہے۔ اسی طرح سورۃ انفال میں دوسری جگہ ہے۔

(۲) يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۝ (۸/۲۴)

اے جماعتِ مومنین! تم اللہ اور رسول کی دعوت کا جواب دو۔ جب وہ تمہیں اس بات کی طرف بلائے جو تمہیں (موت سے نکال کر) زندگی عطا کردے۔

یہاں بھی اللہ اور رسول کا ذکر ہے اور صیغہ (دَعَاكُمْ) واحد ہے۔ اسی طرح سورۃ نور میں ہے۔

(۳) وَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُ الْحَقُّ يَاْتُوْا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ (۲۴/۴۸)

اور جب ان لوگوں کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے متنازعہ فیہ امور میں فیصلہ کرے تو ان میں ایک کا فریق اس سے گریز کرتا ہے اور اگر ان کا کوئی حق کسی پر جب ہو (جس سے وہ سمجھ لیں کہ فیصلہ ان کے حق میں جائے گا) وہ اس کی طرف سر جھکائے ہوئے چلے آتے ہیں۔

یہاں بھی اللہ اور رسول کی طرف بلائے جانے کا ذکر ہے لیکن بعد میں لِيَحْكُمَ میں صیغہ واحد ہے اور اِلَيْهِ میں ضمیر واحد کی ہے۔

(۴) يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۔ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ۔ (۸/۱)

تجھ سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ مالِ غنیمت اللہ اور رسول کا ہے۔

اس آیت سے ذرا آگے چل کر ہے۔

(۵) وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ۔ (۸/۴۱)۔

اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہیں مالِ غنیمت سے ملے اس کا پانچواں حصّہ " اللہ اور رسول " کا ہے۔

(۶) کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ وَ رُسُلِیْ (۵۸/۲۱)۔ (ترجمہ) ضرور ہے کہ میں اور میرے رسل غالب رہیں گے۔

ان تمام مقامات نیز (۵/۳۳) میں " اللہ اور رسول " سے مراد امام، امیر یا مرکزِ ملّت ہے۔ یہ مفہوم نیا نہیں ہے بلکہ شروع سے ہی ایسا سمجھا جاتا رہا ہے اور اب بھی ایسا سمجھا جاتا ہے۔ اس پر ہمارے دَور کی دو تفسیریں ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی اور تفہیم القرآن، مودودی صاحب (مرحوم) کی شاہد ہیں۔

ثابت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے الفاظ ایک قرآنی اصطلاح کے طور پر آئے ہیں اور اس سے مراد اس نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے جو نظام حضورؐ نے خود قائم فرمایا ہے اور اس نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت کوئی الگ اطاعت نہیں ہے جس کے لئے حدیث شریف یا وحی خفی کا موجود ہونا ضروری قرار دیا جائے۔

لفظ حکمت کا صحیح مفہوم

جب اور کوئی سہارا ہمارے علمائے عظام کو اپنے موقف کی تائید میں نہیں ملا تو وہ اپنی تائید میں حکمت کے لفظ سے سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ حکمت سے مراد حدیث اور وحی خفی ہے۔ لیکن قرآنی آیات سے اس بات کی کوئی سند نہیں ملتی۔ حکمت یقیناً مُنزّل مِنَ اللّٰہ ہے مگر یہ بھی قرآنِ کریم کے اندر ہی محفوظ ہے۔ ہر قانون کی غایت اس کی لِمْ اس کا (RATIONALE) اس کی حکمت اور اس کی (WHY OF IT) ہے۔ مثلاً اِنْ تَنْصُرُ اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ۔ (اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا) میں اللہ کی مدد کرنے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر تم نے اللہ کی مدد کی تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ خدا کی مدد کرنے کی حکمت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ہماری مدد فرمائے گا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہمارے قدموں کو جما دیگا۔)

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ میں صلوٰۃ کی حکمت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ صلوٰۃ فحش اور منکر سے باز رکھتی ہے۔ روزوں کی حکمت لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ (تاکہ تم قانونِ خداوندی کو غالب کر دو۔ اس عوض میں کہ اللہ تمہاری ہدایت فرمائی) بیان ہوئی ہے کہ روزوں کی حکمت یہ ہے کہ قانونِ خداوندی کو غالب کیا جائے۔ آیتِ کریمہ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ میں ہدایتِ خداوندی نازل فرمانے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر وحیٔ الٰہی کا اتباع کیا جائے تو معاشرہ میں کسی قسم کا خوف و حزن باقی نہیں رہے گا۔ اتباعِ وحی

کی حکمت یہ ہے کہ معاشرہ سے خوف و حزن جاتا رہے۔ کتاب و حکمت دونوں خدا تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ملے ہیں اور قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔

اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ۔ (۴/۱۱۳)

خدا نے تیری طرف کتاب و حکمت کو نازل کیا۔

وَ مَا اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِه (۲/۲۳۱)

اور جو کچھ اتارا ہے اوپر تمہارے کتاب سے اور حکمت سے نصیحت کرتا ہے تم کو ساتھ اس کے۔

کتاب و حکمت کے لئے صرف ایک ضمیر بہٖ کی استعمال کر کے واضح کر دیا کہ کتاب و حکمت ایک ہی چیز ہے۔ سورۂ احزاب میں ۳۳/۳۴۔ واضح فرمایا کہ حکمت بھی تلاوت ہوتی ہے۔ اس لئے حکمت وحیٔ غیر متلو ہو ہی نہیں سکتی اور نہ ہی قرآن سے باہر ہو سکتی ہے۔

جزئیات کے تعین کا طریقہ

اب آخری اعتراض جس کا جواب دینا نہایت ضروری ہے۔ یہ ہے کہ جزئیات کا تعین خصوصاً نماز کے ارکان کا تعین کس طرح کیا جائے۔ یہ بات واضح ہے کہ قرآنِ کریم نے احکام و قوانین بیان فرمائے ہیں اور حضورؐ نے ان کی جزئیات اپنی فراستِ فراواں اور فطانتِ بے پایاں سے خود مقرر فرمائی ہیں۔ مثلاً قرآن نے مسافر پر روزہ قصر قرار دیا ہے لیکن مسافر کو DEFINE نہیں کیا۔ حضورؐ نے ۲۸ میل کی مسافت طے کرنے والے کو مسافر قرار دیا ہے۔ قرآن نے چور کی سزا قطع ید فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی صرف ایک سوئی چوری کرے تو وہ چور نہیں ہے نہ ہی اس کا قطع ید ہو گا۔ حضورؐ نے مختلف اشیاء کے نرخ کے مطابق اس کا تعین فرمایا ہے۔ زکوٰۃ کا حکم قرآن نے دیا ہے مگر اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ حضورؐ نے اس کا مکمل نصاب اپنے عہد کے مطابق مقرر فرمایا۔ حج کا حکم قرآن نے دیا۔ حضورؐ نے اس کی جزئیات سعی بین الصفا والمروہ، طواف وغیرہ مقرر فرمائیں۔ اسی طرح قرآن نے صلوٰۃ کا حکم دیا۔ اس کے مختلف ارکان وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ، وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ، قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ، وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا کی طرف اشارہ فرمایا۔ حضورؐ نے اصولی قانون اور اس کے ارکان کی طرف اشارات کو پیشِ نظر رکھ کے اپنی فراست و ذہانت، فہم و ذکا سے نماز کی جزئیات مقرر فرمائیں۔ یہی نماز حضورؐ کے دور سے اب تک امت میں بالاستقلال چلی آ رہی ہے جس پر ساری امت عمل پیرا اور کاربند ہے۔

مختصر یہ کہ ہدایتِ خداوندی وحی کے ذریعہ ہی ملتی ہے۔ یہی وہ ہدایت ہے جس کے تابع زندگی بسر کر کے، دنیا میں وہ معاشرہ قائم ہوتا ہے جس میں نوعِ انسان سکون و اطمینان سے زندگی بسر کر سکے۔ وحی وہ قانون ہے جس کے مطابق انسانوں کو زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ یہ ضابطہ یا قانون، عقلِ انسانی کا پیدا کردہ نہیں بلکہ انسانی عقل سے ماوراء

ہے۔ وحی عقلِ انسانی کے ساتھ بعینہٖ وہی درجہ رکھتی ہے جو درجہ سورج کا آنکھ کے ساتھ ہے۔ اگر انسانی آنکھ موجود ہو لیکن سورج کی روشنی نہیں ہے تو آنکھ کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتی۔ اسی طرح فکرِ انسانی وحی کی رہنمائی کی محتاج ہے۔ اور وحی صرف اور صرف قرآنِ کریم میں محفوظ ہے۔ خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے۔ قرآنِ کریم نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے واضح، روشن قندیل ہے جس سے متمسک رہ کر، انسانی مصائب و مسائل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم، جمع جمع کا ساتھی ہے اور ہر مشکل کا حل۔ قرآنِ کریم ہی وہ مشکل کشا ہے جس کے ذریعہ تمام آفات و مصائب کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ خود، نور اضیاء، واضح، مبین ہے اور دوسروں کو منوّر کرنے والا ہے۔ نوعِ انسان کی بدقسمتی تھی جس دن غیر وحی کو وحی کا درجہ دے کر قرآنِ کریم کے برابر قرار دیا گیا اور اس طرح سے ہر نظریہ کو JUSTIFY کرنے کا چور دروازہ کھولا گیا۔

وَ ھٰھُنَا تَمَّ مِنَّا الْکَلَامِ
عَلٰی مُصْطَفٰنَا اُلُوْفٌ سَلَام

کِتَابُ اللّٰہ

رسول اللہ (صلعم) نے اپنے آخری حج کے خطبہ مین (وفات سے تین ماہ قبل) فرمایا:۔

وَ قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ
اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ ــ کِتَابُ اللّٰہ۔

مین تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں جس سے اگر تم وابستہ رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے ـــ وہ چیز کتاب اللہ ہے۔

(مسلم۔ نسائی۔ ابوداؤد)

محمد اسلم انا
ڈنمارک

جدید ٹیکنالوجی اور علمِ باطن

قرآنی نظام قائم ہوا، تو ملوکیت، سرمایہ داری اور پیشوائیت کے تینوں اژدھے بھسم ہو کر رہ گئے لیکن سیمرغ کی طرح یہ اژدھے بھی اپنی ہی خاکستر سے اُبھر پڑتے ہیں۔ بنوامیہ کے دَور میں پہلے مذہبی پیشوائیت نے جنم لیا اور پھر اسی نے ملوکیت کو زمین پر "خدا کا سایہ" کہہ کر عوام کے اذہان پر مسلط کر دیا۔

خلافتِ عباسیہ قائم ہوئی، تو اس نے داستان گو وقائع نگاروں کو روایات کے صحیفے مرتب کرنے کی کھلی چھوٹ دے دی جنھوں نے اُمتِ مسلمہ کو صلوٰۃ قائم کرنے کی بجائے صلّی یعنی نماز پڑھنے والا بنا دیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو جمود چاٹ گیا۔ تحقیق کے دروازے بند ہو گئے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے والا مسلم تسبیح اور سجدے تک محدود ہو کر رہ گیا۔

مٹھی میں بند کیا ہوا، بچوں کے کھیل میں
جگنو کے ساتھ اس کا اُجالا بھی مر گیا

ذہانت کو شخصیت پرستی کے بُت نے کُند کر دیا، فکر و عمل روایات کی نذر ہو گئے۔ عقیدہ وضع کیا گیا کہ قرآن کے معنی سمجھنے کی ضرورت نہیں، اس کے الفاظ دہرا لینے سے ڈھیروں ثواب مل جاتا ہے اور اگر کسی کو پڑھنا نہ آتا ہو تو وہ اس کی سطروں پر ہی انگلیاں پھیر لیا کرے، اس سے تلاوت کا ثواب مل جاتا ہے۔ اربابِ طریقت نے نظریہ قائم کیا کہ قرآن کا حقیقی مطلب اس کے لسانی مفہوم سے سامنے نہیں آسکتا۔ "اس کے باطنی معنی ہیں" اور وہ ارباب طریقت کے پاس سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں۔ لہٰذا، قرآن کا مفہوم ان باطنی معنی کی رُو سے ہی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگر کسی ہوشمند نے قرآن پر غور و فکر کرنے کا ارادہ کیا تو علم و دانش کے ان دشمنوں نے اس سے کہہ کر چپ کرا دیا کہ قرآن میں غور و فکر کی کوئی گنجائش نہیں، اس کا جو مطلب سمجھا جا سکتا تھا وہ سمجھا جا چکا ہے۔ تم اسلاف کے بتائے ہوئے مفہوم سے ذرا بھی اختلاف نہیں کر سکتے۔ سلفِ صالحین نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہی صراطِ

مستقیم ہے۔

امت سلفِ صالحین کی خواب آور لوریوں کے تنویمی عمل سے سجدے میں گر گئی اور تینوں اژدھے دندناتے رہے۔ قوم اور ملک کے محافظ ان اژدھوں کی بالادستی کو قائم رکھنے کے لئے قوم کو شانت کرتے ہیں ایسے مشغول ہوئے کہ بیرونی خطرات سے نپٹنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہو گئے۔ ۱۲۵۸ء میں جو بھیانک سیلاب کی صورت میں نمودار ہوا اس نے سلطنتِ عباسیہ کو دجلہ اور فرات میں بہا دیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں نپولین مصر پر حملہ آور ہوا اور مصر کے حکمران مراد بک نے جامع ازہر کے علما کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ ان علما نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ ہمیں جامع ازہر میں بخاری شریف کا ختم کرانا چاہیئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن ہنوز بخاری شریف کا ختم اختتام تک بھی نہ پہنچا تھا کہ مصر کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تو امیرِ بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختمِ خواجگان پڑھا جائے۔ چنانچہ ادھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں اور ادھر ختمِ خواجگان میں بیٹھے لوگ یا مقلب القلوب یا محول الاحوال کے ورد میں مصروف تھے۔ توپیں جیت گئیں اور ختمِ خواجگان ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق وطنِ عزیز میں ۲۶ فیصد خواندگی پائی جاتی ہے۔ اس میں سے ایک حصہ سرکاری مشینری کا کل پرزہ بنتا ہے اور دوسرا حصہ قوم کے نونہالوں کی تعلیم و تدریس پر مامور۔ سرکاری مشینری کا سارا زور پراپیگنڈہ پر صرف ہوتا ہے اور تعلیم و تدریس پر مامور غریب والدین کا خون نچوڑتے رہتے ہیں۔ ۴۳ برس گزر جانے پر بھی قوم کا صرف ۲۶ فیصد حصہ خواندہ ہے۔ ان تین اژدہوں کے علیحدہ علیحدہ معاشی نظاموں کی بدولت وطنِ عزیز کی اقتصادی حالت اس قدر ابتر ہو رہی ہے کہ ملک و قوم کے نام سے لیا ہوا قرض ادا کرنے کے لئے مزید قرض لینا پڑتا ہے۔ سطحِ سمندر پر موجوں کی طلاطم خیزی پر نگاہ ڈالیں، تو اس غیر ملکی امداد کی کُنہ و ماہیت خود بخود سمجھ میں آ جائیگی۔ سمندر اس طلاطم کی بدولت اپنے ذخائر میں سے جھاڑ جھنکار کو جو بے کار اور بے مصرف ہوتا ہے، اپنی سطح سے ساحلوں کی طرف دھکیلتا رہتا ہے جس میں سے کچھ چیزوں کو مفاد پرست نوادرات کے نام سے اپنی اپنی دکانوں میں سجا لیتے ہیں۔ اسی سمندر کی طرح ترقی یافتہ ممالک میں بھی وہاں کی انڈسٹری دن رات طلاطم خیز رہتی ہے جس سے ان کے ہاں صنعتی پیداوار ضرورت سے کہیں زیادہ جمع رہتی ہے یا نت نئی جدت کی وجہ سے معیار سے گر جاتی ہے جو نوادرات کے طور پر علیحدہ رکھ لی جاتی ہے۔ جب ترقی پذیر ممالک خصوصاً ہمارا ملک اپنے ترقیاتی منصوبوں اور دفاعی ضرورت کی اہم اشیاء کے لئے ان ترقی یافتہ ممالک سے قرض حاصل کرتا ہے (جس کے لاتعداد مراحل ہیں) تو قرض

اس شرط پر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ضرورت کا تمام سامان اسی ملک سے خرید سکتے ہیں جس نے قرضہ دیا۔ صرف اتنا ہی نہیں، ان کا تقاضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس سامان کے ساتھ ہنر مند بھی انہی کے ہوں گے۔ جن کا معاوضہ بھی ان کے معیار سے ہوگا اور رہائش بھی۔ اس طرح ان کا وہ سامان جو ان کے اپنے معیار سے گر کر جھاڑ جھنکار کا درجہ حاصل کر چکا ہوتا ہے نوادرات کی قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔ ہمارے انجینئر اور فوجی جب ان اشیاء کے استعمال سے آشنا ہوتے ہیں تب ان اشیاء کے لئے فاضل پُرزوں کی ضرورت محسوس ہوتی جو خود دستیاب نہیں ہو سکتے اور پھر تمام جھاڑ جھنکار بھک سے اُڑ جاتا ہے اور قوم کو پھر سے گروی رکھنے کے منصوبے تیار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہُنر مند جب سامان کے ساتھ آتے ہیں تو وہ ملک اور قوم کے اہم ترین رازوں اور وطن کی چپہ چپہ زمین سے واقف ہو جاتے ہیں۔ مقروض تو ہو ہی چکے تھے ــــ حفاظت سے بھی محروم ہو گئے ــــ

ٹیکنالوجی ــــ جس کے لغوی معنی حرفیات، صنعتیات اور ہنروں کا بیان، بالالفاظِ دگر، صنعتی فنون کا علم ہیں ـ اللہ تعالیٰ کا فرمان کیا ہے:۔

> ایک سمندر پر ہی کیا موقوف ہے، کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی ہے، اس نے سب کو تمہارے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں (اس بات کی کہ جو لوگ ان قوانین کا علم حاصل کر لیں گے، جن کے مطابق یہ کارگہ کائنات سرگرمِ عمل ہے، وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے اپنے کام میں لائیں گے)۔ (سورۃ الجاثیہ آیت ۱۳ مفہوم القرآن)

جس قوم کا ہر فرد تعلیم یافتہ ہوگا وہاں غور و فکر اور تحقیق کے باب حدود فراموش ہو جائیں گے۔ سو فی صد خواندگی ہونے سے معاشرہ ہم آہنگ اور ہم ساز ہو جاتا ہے۔ ایسے معاشرے کے لئے الیگزنڈر پوپ نے کیا خوب کہا ہے:۔

THE LEARNED IS HAPPY, NATURE TO EXPLORE.

مغربی اقوام "علم" کے زیور سے آراستہ ہی نہیں بلکہ مرصع ہیں۔ جبھی تو کائنات کی وسعتوں کو کھنگال رہی ہیں ـ انھوں نے زمین کے مدار میں ایک ایسا سٹیلائیٹ چھوڑ رکھا ہے جس کے ذریعے وہ باقی اقوام خصوصاً ہم مسلمانوں کے روز و شب سے مکمل آگاہی رکھتی ہیں۔ کمپیوٹر کے ایک بٹن دبانے سے حسبِ خواہش ملک کا مخصوص گوشہ فوراً ان کے سامنے سکرین پر نمودار ہو جاتا ہے۔ قرآن نے کائنات کی قوتوں کو مسخر کرنے والوں کے لئے "لوگ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ادھر ہماری حالت یہ ہے کہ دنیا میں ایک ارب کی تعداد کا بحرِ بیکراں ہے اور وارثِ قرآن ہوتے ہوئے بھی ظلمات کے دبیز پردوں تلے دبے ہوئے ہیں۔ مذہبی پیشوائیت نے عقل کو پابندِ سلاسل کرتے ہوئے غور و فکر کے

تمام باب غیر اسلام قرار دیتے ہوئے بند کر رکھے ہیں۔ الیگزنڈر پوپ کا دوسرا مصرع یوں ہے۔

THE FOOL IS HAPPY THAT HE KNOWS NO MORE.

دشت کا بھیڑیا ــــ ہلاکو! اسلامی جماعت میں پھیلے ہوئے ناسور کے لئے نشتر ضرور تھا مگر جراح نہ تھا۔ حکم کی عدم موجودگی سے اس کا لگایا ہوا زخم رستے رستے ساری امتِ مسلمہ میں پھیل گیا۔ اسلامی جماعت بھول گئی اور اب تک بھولی ہوئی ہے کہ رفاقت صرف دو میں پنپ سکتی ہے۔ اس کو انگلش میں TWO IS A COMPANY ، THREE IS A CROWD کہتے ہیں۔ لہٰذا، ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام، معاشی، معاشرتی تحفظ کا ایک ایسا عدیم النظیر نظام پیش کرتا ہے جس کو دنیا نے عملی صورت میں دیکھا ہے اور ابھی تک اس کی مثال پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اس نظام کے متعلق وعدہ ہے کہ:

آخر الامر دینِ اسلام کو تمام نظامہائے پر غالب آکر رہنا ہے۔ (۶۱/۱۲-۸؛ ۵۸/۲۱؛ ۹/۳۲-۳۳)

اس کے لئے شرط ہے کہ صاحبانِ دانش و بینش، اولی الابصار اور اولی الالباب قرآن میں غوطہ زن ہوں اور جب وہ صدقِ دل سے ایسا کریں گے تو اس صدف سے اسی نظام کا گوہرِ نایاب لئے ابھریں گے اور یہی ہوں گے وہ علمِ باطن کے حامل۔

موجوں کی تپش کیا ہے فقط ذوقِ طلب ہے
پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد

رزق میں مساوات

حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ اشعر کے قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے پاس کھانا تھوڑا رہ جاتا یا مدینے میں ان کے بال بچوں پر فاقہ کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ سب اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔ (بخاری و مسلم)

حقائق وعبر

۱۔ منکرینِ حدیث

۱۔ منکرینِ حدیث کی فہرست جو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل السلفی نے اپنی کتاب "جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث" میں درج فرمائی ہے۔

نام منکرینِ حدیث	کتنی حدیثوں کا انکار کیا	کب
۱۔ خوارج	جو اہلِ بیت کے فضائل میں تھیں	سنہ ۲۰۰ھ
۲۔ شیعہ	جو احادیث صحابہؓ کے فضائل میں تھیں	"
۳۔ معتزلہ اور جہمیہ	احادیثِ صفات	
۴۔ قاضی عیسیٰ بن ابان اور ان کے اتباع	جو احادیث غیر فقیہ صحابہ سے مروی ہیں۔	سنہ ۲۲۱ھ
۵۔ متاخرین فقہاء سے قاضی ابوزید دبوسی وغیرہ	" " " " " "	"
۶۔ اس کے بعد معتزلہ اور متکلمین کے ساتھ متاخرین فقہاء کی ایک مختصر سی جماعت۔	اصول اور فروع دونوں میں ان حضرات نے خبر واحد سے اختلاف کیا۔	سنہ ۴۰۰ھ کے بعد
۷۔ یورپین تہذیب سے مرعوب گروہ، مولوی چراغ علی، سر سید احمد خاں وغیرہ۔	یہ حضرات فن سے قطعاً ناواقف تھے ان کی تحقیق میں احادیث تاریخ کا ذخیرہ ہیں۔ جو ان کے نیچر کے موافق ہوا قبول کر لیا اور جو مخالف ہوا ترک کر دیا۔	سنہ ۱۳۰۰ھ کے قریب
۸۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی۔ مستری محمد رمضان گوجرانوالہ، مولوی حشمت علی لاہوری، مولوی رفیع الدین ملتانی۔	احادیث کا بالکلیہ انکار	سنہ ۱۳۰۰ھ کے بعد
۹۔ مسٹر غلام احمد پرویز، مولوی احمد دین صاحب امرتسری	ان کے نزدیک قرآن وحدیث اور پورا دین ایک	

یہ حضرات سرسید سے متأثر ہیں لیکن جاہل اور غیر محتاط۔ مولوی احمد دین بعض متواتر اعمال کو مستثنیٰ سمجھتے تھے۔ کھیل ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی نظریہ جسے ہر وقت ہمیں بدلنے کا حق حاصل ہے۔ ۱۴۰۰ھ

۱۰۔ مولانا شبلی مرحوم، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور عام فرزندانِ ندوہ، باستثنائے حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ۔ یہ حضرات حدیث کے منکر نہیں لیکن ان کے اندازِ فکر سے حدیث کا استخفاف اور استحقار معلوم ہوتا ہے اور طریقہ گفتگو سے انکار کے لئے چور دروازے کھل سکتے ہیں۔ ۱۴۰۰ھ / ۱۳۰۰ھ

۲۔ مزید اضافہ جو صاحب گنج چھپرہ (بھارت) سے ایک صاحب نے فرمایا:۔

۱۔	امام بخاری۔ (جنھوں نے چھ لاکھ احادیث میں سے صرف ۷۲۷۵ کو درج کتاب کیا)	۵,۹۲,۷۰۰	وفات ۲۵۶ھ / ۸۷۰
۲۔	امام مسلم۔ (جنھوں نے تین لاکھ احادیث میں سے صرف ۴۳۴۸ کو درج کتاب کیا)	۲,۹۵,۶۵۲	۲۶۱ھ / ۸۷۵
۳۔	ابن ماجہ (جنھوں نے چار لاکھ احادیث میں سے صرف چار ہزار کو درج کتاب کیا)۔	۳,۹۶,۰۰۰	۲۷۳ھ / ۸۸۶
۴۔	ابوداؤد۔ (جنھوں نے پانچ لاکھ احادیث میں سے صرف ۴۸۰۰ کو درج کتاب کیا)	۴,۹۵,۲۰۰	۲۷۵ھ / ۸۸۸
۵۔	ترمذی۔ (جنھوں نے تین لاکھ احادیث میں سے صرف ۳۱۱۵ کو درجِ کتاب کیا)۔	۲,۹۶,۸۸۵	۲۷۹ھ / ۸۹۲
۶۔	نسائی۔ (جنھوں نے دو لاکھ احادیث میں سے صرف ۴۳۲۱ کو درجِ کتاب کیا)۔	۱,۹۵,۶۷۹	۳۰۳ھ / ۹۱۵

امام بخاری کو بقول لوگوں کے بارہ لاکھ احادیث ملی تھیں، ورنہ چھ لاکھ کا تو خود ان کو اقرار ہے۔ ان چھ لاکھ احادیث میں سے امام بخاری نے صرف سات ہزار کچھ سو کو لیا اور پانچ لاکھ بانوے ہزار سات سو احادیث کا سرے سے انکار کر دیا بلکہ انھیں ضائع کر دیا۔ دنیائے اسلام میں امام بخاری سے بڑا منکرِ حدیث تو آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ حالانکہ انھیں خادمِ حدیث بتایا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر آج کوئی شخص ان سات ہزار کئی سو احادیث میں سے کسی کا انکار کرتا ہے تو یہ راہ دکھائی ہوئی امام بخاری ہی کی ہے۔ آج احادیث کی جتنی کتابیں ہیں، ان میں احادیث کی مجموعی تعداد ایک

لاکھ بھی نہیں۔ اگر کوئی شخص ان سب کا بھی انکار کر دے تو بھی وہ امام نسائی کی بھی گرد نہیں پہنچ سکتا چہ جائیکہ امام بخاری، جنھوں نے پانچ لاکھ بانوے ہزار سات سو احادیث کا انکار کر کے منکرینِ حدیث کی فہرست میں سرِفہرست اپنا نام چھوڑا ہے۔

طلوعِ اسلام

اس ضمن میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ ان ائمہ جامعینِ حدیث نے یہ دعوے نہیں کیا تھا کہ انھوں نے براہِ راست رسول اللہ سے (بذریعہ الہام) دریافت کر لیا تھا کہ کون کون سی حدیثیں قبول کی جائیں اور کون سی رد کر دی جائیں گی۔ انھوں نے یہ کچھ اپنے قیاس سے کیا تھا تو کیا یہ چیز تعجب انگیز نہیں کہ جو لوگ اپنے قیاس سے لاکھوں حدیثوں سے انکار کر دیں وہ تو خادمانِ حدیث قرار پائیں اور جو شخص ان میں سے کسی ایک حدیث کو بھی صحیح ماننے سے انکار کر دے اسے منکرِ حدیث ٹھہرا دیا جائے۔

۲۔ یہاں تک تو آئے

"اسلامی معاشرے میں انقلابی قوت کو شیعہ سنی اور مقلد و غیر مقلد کا عنوان نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کا عنوان صرف اسلام اور اس کے کارکن صرف مسلمان ہیں۔ یہ گروہ بندیاں بندانِ خود اسلام دشمنی کا مظہر ہیں۔ ان کے ذریعے اسلامی انقلاب کا خواب دیکھنا، ہوا میں تیر چلانے کے مترادف ہے۔

دینی مدارس تعلیم و تربیت کے لئے ہوتے ہیں، مگر ہمارے ہاں یہ مورچے ہیں جہاں سے دوسرے مکاتبِ فکر پر تیر اندازی کے لئے طلباء کو مشق کرائی جاتی ہے۔ مسجدیں خانہ خدا نہیں بلکہ "مذہبی ڈیرے" ہیں، جن کے دروازوں پر مختلف بورڈ آویزاں ہیں اور اس شناخت کے بغیر محض بندگیٔ رب کے لئے داخلہ ممنوع ہے۔"

یہ اقتباس ماہنامہ الفجر کراچی بابت اگست ۱۹۹۱ء کے اداریہ سے لیا گیا ہے۔

جمہوریت یا ملوکیت؟

اہلِ حدیث حضرات کی جانب سے آجکل جمہوریت کے خلاف زبردست مہم چلائی جا رہی ہے۔ ان کا شاید ہی

کوئی اخبار یا رسالہ ایسا ہو جس میں جمہوریت کے خلاف زہر نہ اگلا جا رہا ہو۔ ان کے سب سے زیادہ سنجیدہ رسالے ترجمان الاعتصام میں جمہوریت کے طریق انتخاب کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"جمہوریت چونکہ ایک بے لگام گھوڑا ہے لہٰذا اس کے ذریعے اسلام کی گاڑی کو نہیں کھینچا جا سکتا۔ جمہوریت انتخاب کی مرہونِ منت ہے اور انتخابات عوام کے ووٹوں سے منعقد ہوتے ہیں۔ اس لئے ووٹ حاصل کرنے والا خود کیسا ہی متقی ہو، اسے عوام کی بات ماننی ہی پڑے گی لہٰذا یہاں اسلام بھی ویسا ہی ہوگا جو عوام چاہیں گے بلکہ چاہتے ہیں نہ کہ خدا اور رسول کا اسلام، جو ووٹ سے نہیں، وحیٔ الٰہی کو اہمیت دینے سے نافذ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں "اسلامی جمہوریہ پاکستان" جمہوریہ تو ہے مگر اسلامی نہیں نظر اٹھا کر دیکھئے تو ووٹ دینے والوں میں ڈاکو اور چور بھی اتنا ہی معزز ہے جتنا کوئی شریف شہری ــــ سمگلنگ اور بلیک مارکیٹ کرنے والے بھی اتنے ہی معتبر ہیں جتنے حلال کی روزی کمانے والے ــــ اس لئے حکومت عوام پر اپنا حکم تو جاری کر سکتی ہے، مگر اس پر عملدرآمد نہیں کروا سکتی۔ کیونکہ اس پر عوام کا خوف طاری ہے وہ سمگلروں اور ڈاکوؤں کو تو پکڑ سکتی ہے مگر سزا نہیں دے سکتی۔ سرکاری پلاٹ، سڑکوں اور بازاروں پر قابض لوگوں کے خلاف، ناجائز تجاوزات کا قانون تو جاری کر دیتی ہے مگر ان کے قبضے سے مقبوضہ املاک واپس نہیں لے سکتی۔ ان لوگوں کے سرپرست ایم پی اے اور ایم این اے ہیں اور حکومت میں مؤثر لابی رکھتے ہیں کیونکہ انہیں لوگوں سے ووٹ لینے ہوتے ہیں اس لئے اپنے ووٹروں کے تمام جائز و ناجائز کاموں میں انہیں ان کی سرپرستی کرنی پڑتی ہے۔ سندھ کے ڈاکو ہوں یا پنجاب کے تخریب کار، ان کی بھی سرپرستی ان ووٹ حاصل کرنے والی شخصیات ہی کر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں نہ معیشت میں ٹھہراؤ ہے نہ معاشرت میں امن و سکون۔ مہنگائی سے بازار اور منڈیاں عوام کے لئے "لوٹ چڑھ خانے" بنے ہوئے ہیں اور تخریب کاری کے ہاتھوں لوگوں کی نیندیں حرام ہو چکی ہیں۔ راتوں کو ہی نہیں بلکہ دن میں بھی کوئی گھر ان تخریب کاروں کے متوقع حملے سے محفوظ نہیں۔

اس تمام بے چینی اور اضطراب کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ "جمہوریت" ہے حکومت بنانے والے لوگ تو اپنے ووٹروں سے خوفزدہ ہیں، قوم کی اصلاح کرنیوالے ہاتھ کہاں سے آئیں گے ــــ جب تک یہاں صرف خدا سے ڈرنے والی حکومت نہیں

آئے گی اور ایسی حکومت شاید ہی آئے! ملک میں امن و سکون نہیں آسکے گا۔ جمہوریت یا جمہور کا خوف ملک کی اصلاحِ احوال میں سدِّ راہ ہے اس کے تدارک کا تو ایک ہی راستہ ہے اور وہ اسلام کا راستہ ہے۔"

(ہفت روزہ الاعتصام ۲۶ جولائی ۱۹۹۱ء، صفحات ۱، ۲)

طلوعِ اسلام

ہم مدیر الاعتصام سے متفق ہیں کہ سیاسی پارٹیوں پر مبنی جمہوری نظام قرآن و سنّت سے متصادم ہے۔ لیکن اس کا حل اسلام ہی کے نام پر قائم ملوکیت بھی تو نہیں۔ کاش علماء اہلِ حدیث "اسلام کا راستہ" کی مبہم اصطلاح استعمال کرنے کی بجائے اسلامی نظام کے خدوخال بھی واضح فرمائیں تاکہ خلقِ خدا جان سکے کہ اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے اس ملک میں وہ کس قسم کا نظامِ حکومت قائم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ قارئین کی تجدید یادداشت کے لئے سیکولر سٹیٹ اور دو قومی نظریہ پر علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کے دو مختصر مضامین اس پرچہ میں شاملِ اشاعت ہیں۔

۴۔ طبِّ نبویؐ

ہفت روزہ جریدہ "تنظیم اہلِ حدیث لاہور" ان دنوں ڈاکٹر خالد غزنوی کی کتاب "طبِّ نبویؐ" کو بالاقساط شائع کر رہا ہے۔ اس موضوع پر فرقہ اہلِ حدیث کے جیّد امام علامہ ابنِ قیّم کی ایک مستند کتاب پہلے سے موجود ہے جس میں طبِّ نبویؐ کے اصولوں کے علاوہ ایک سو کے قریب ادویہ کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ اس کے برعکس ڈاکٹر خالد غزنوی صاحب نے ان احادیث کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے جنہیں علامہ موصوف ضعیف یا جھوٹی قرار دے چکے تھے۔

طبِّ نبویؐ میں ایک لفظ "نکتۃً" بار بار استعمال ہوا ہے جس کے معنی مُنہ کا ذائقہ کے ہیں لیکن ڈاکٹر غزنوی اس کے معنی سالن یا شوربہ کرتے ہیں۔ کہیں وہ منقّی بطور سالن استعمال کراتے ہیں اور کہیں اترج کا مطلب سنگترہ بتاتے ہیں حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ لیموں ہے اور ان دونوں کے خواص میں بہت فرق ہے۔

حیرت ہے کہ مصنف کی اس کتاب کو جو علامہ ابن قیّم کی تحقیق سے جا بجا متصادم اور کئی لحاظ سے محلِ نظر ہے

صدارتی انعام سے نوازا گیا ہے۔

ضمناً رسول اللہ نے طب کے جو اصول بتائے ہیں۔ اُن کی روشنی میں انگریزی طریق علاج غلط قرار پاتا ہے کیونکہ آپ نے فرمایا ہے کہ ہر بیماری کا علاج اسی علاقے کی خوراک اور جڑی بوٹیوں میں موجود ہے جب کہ انگریزی ادویات درآمد کی جاتی ہیں۔ نیز یہ کہ انگریزی ادویات عموماً مرکبات کی شکل میں ہوتی ہیں جب کہ آپ نے مفرد دواؤں کے استعمال کو بہتر بتایا ہے۔

۵۔ منصب خلافت کے تقاضے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب "خلافت و ملوکیت" سے اقتباس نقل کرتے ہوئے ہفت روزہ "ایشیا" لاہور اپنی ۲۱ جولائی کی اشاعت میں رقمطراز ہے :۔

"اب خلافت کو لیجئے یہ عربی زبان میں نیابت کے لئے بولا جاتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا میں انسان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ زمین پر خدا کا نائب ہے یعنی اس کے ملک میں اس کے دیئے ہوئے اختیارات استعمال کرتا ہے۔ آپ جب کسی شخص کو اپنی جائداد کا انتظام سپرد کرتے ہیں تو لازماً آپ کے پیش نظر چار باتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ جائداد کے اصل مالک آپ خود ہیں نہ کہ وہ شخص، دوسرے یہ کہ آپ کی جائیداد میں اس شخص کو آپ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق کام کرنا چاہیئے۔ تیسرے یہ کہ اسے اپنے اختیارات ان حدود کے اندر استعمال کرنا چاہیئے جو آپ نے اس کے لئے مقرر کر دی ہیں۔ چوتھے یہ کہ آپ کی جائیداد میں اسے آپ کا منشا پورا کرنا ہوگا، نہ کہ اپنا۔ یہ چار شرطیں نیابت کے تصور میں اس طرح شامل ہیں کہ نائب کا لفظ بولتے ہی خود بخود انسان کے ذہن میں آجاتی ہیں۔ اگر کوئی نائب ان چاروں شرطوں کو پورا نہ کرے تو آپ کہیں گے کہ وہ نیابت کے حدود سے تجاوز کر گیا اور اس نے وہ معاہدہ توڑ دیا جو نیابت کے عین مفہوم میں شامل تھا۔ ٹھیک یہی معنی ہیں۔ جن میں اسلام انسان کو خدا کا خلیفہ قرار دیتا ہے۔"

علامہ الماوردی نے اسلامی حکومت کے بارے میں اپنی مشہور کتاب "الاحکام السلطانیہ" کے صفحہ ۱۵ پر امت مسلمہ کے تمام ائمہ کا یہ متفقہ قول نقل کیا ہے کہ جو کوئی انسان کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ سمجھے وہ فاسق و فاجر ہے۔ امام ابن تیمیہ اس سے ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ وہ ایسے شخص کو کافر و مشرک قرار دیتے ہیں۔

(الفتاوی الکبری تالیف امام ابن تیمیہ، جلد دوم ص ۵۵۳)

۶۔ لو وہ بھی کہتے ہیں

"یہاں یہ بات بھی واضح ہے کہ زکوٰۃ صرف غربا، مساکین، مسافروں اور تاوان یا قرض کے تلے دبے ہوئے لوگوں پر ہی صرف نہیں کی جائے گی بلکہ ریاست کے تمام ملازمین کے مشاہرے، اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں سیاسی اخراجات، دین کی تبلیغ و اشاعت، تعلیم و تدریس، جہاد و قتال اور خدمتِ خلق کی ذمہ داریاں بھی اس کے معارف میں شامل ہیں۔ یہاں یہ بھی واضح ہونا چاہیئے کہ عوامل پیداوار ذاتی استعمال کی چیزوں اور حدِ نصاب سے کم سرمایہ کے سوا کوئی چیز بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں۔ دوسرے یہ کہ صنعتی پیداوار کا الحاق اموالِ تجارت کی بجائے مزروعات سے ہونا چاہیئے۔"

یہ اقتباس ماہنامہ "تذکیر" لاہور بابت جولائی ۱۹۹۱ء میں اسلامی معیشت کے عنوان سے شائع ہونے والے مضمون کے صفحہ ۱۲ سے لیا گیا ہے۔

قرآنی تعلیم، بچوں کے لئے

قاسم نوری

(۲)
کائنات

السلام علیکم بچو! اس سے پہلے کہ آپ یہ مضمون شروع کریں اس کی پہلی قسط ایک مرتبہ پھر پڑھ لیں تاکہ اس اہم موضوع کا تسلسل قائم رہے اور سمجھنے میں آسانی ہو۔ پھر بھی کچھ سمجھ میں نہ آئے تو آپ خط لکھ کر معلوم کر سکتے ہیں۔

پیارے بچو! قرآن کے حوالے سے قرآن کی کہانی کچھ یوں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ارادہ کیا کہ وہ کائنات بنائے جس میں بہت ساری دنیائیں ہوں، بہت ساری زمینیں اور آسمان ہوں، طرح طرح کی مخلوق ہو اور طرح طرح کی چیزیں ہوں اور یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے یعنی سب کچھ اس کے اختیار اور ارادے میں ہے (۱۷/۹۹)۔

جس وقت وہ کسی شے سے کہتا ہے کہ "ہو جا" تو وہ ہو جاتی ہے (۳۶/۸۲)۔ چنانچہ جب اللہ نے چاہا کہ کائنات وجود میں آجائے تو وہ عدم سے یعنی (NOTHINGNESS) سے وجود میں آگئی۔ (۲/۱۱۷، ۶/۱۴، ۶/۸۰، ۶/۱۰۱) لیکن بھئی کائنات یونہی اتفاقیہ طور پر اور اچانک وجود میں نہیں آئی۔ اللہ چونکہ کوئی بھی چیز بلا مقصد پیدا نہیں کرتا لہٰذا یہ بھی ایک عظیم پروگرام کے لئے وجود میں لائی گئی جس سے ہم (CAUSE AND EFFECTS) اور عمل مکافات کے قانون کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں (۱۰/۴، ۶/۷۳، ۷/۵۷، ۱۰/۵، ۱۴/۱۹، ۱۵/۸۵، ۱۶/۳، ۲۱/۱۶، ۲۹/۴۴، ۳۰/۸، ۳۹/۶، ۴۴/۳۸، ۴۶/۳، ۶۴/۳)۔

قرآنِ کریم کے مطابق اسے چھ ادوار (PERIODS) میں پیدا کیا گیا۔ (۷/۵۴، ۱۰/۳، ۱۱/۷، ۲۵/۵۹، ۳۲/۴، ۵/۲۸، ۵۷/۴) آپ اسے چھ دن کہہ سکتے ہیں لیکن بھئی ایک بات سمجھ لیں کہ اللہ کا کیلنڈر ہم انسانوں جیسا کیلنڈر نہیں ہوا کرتا، نہ اللہ کا نظام ہمارے دن ہفتہ، مہینہ اور سال کے مطابق چلتا ہے۔ اللہ ہر چیز کا مالک ہے اس کا اپنا نظام اور اپنا کیلنڈر ہے۔ اس کا ایک ایک دن (ہمارے) حساب سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ (۳۲/۵) اور پچاس پچاس ہزار سال کا ایک دن بھی ہوا کرتا ہے۔ (۷۰/۴) بھئی اس حساب سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب اللہ نے فرمایا کہ اس نے ارض و سمٰوٰت (کائنات) کو چھ دن میں تخلیق کیا تو اللہ کے یہ دن کتنا طویل عرصہ ہو سکتے ہیں۔

بچو! ایک بات ہم شروع ہی میں بتا دیں کہ یہ ساری کائنات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہیں بنائی گئی بلکہ ایک خاص وقت یا مدت تک کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ (۳۰/۸) اور اللہ اس میں تخلیقی اضافے کرتا بھی رہتا ہے۔ (۱۶/۸، ۳۵/۱) یعنی وہ ایسی تخلیق کرتا رہتا ہے جس کا علم ہمیں نہیں ہے۔ (۱۶/۸)۔

تو بچو اللہ نے کائنات کو پیدا کیا اور وہ اس جیسی اور کائنات پیدا کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ (۱۷/۹۹، ۳۶/۸۱)۔ پھر اللہ نے ہماری دنیا جیسی ڈھیر ساری دنیائیں بنائیں۔ چاند، سورج، ستارے اور بے شمار سیارے بنائے۔ ان سب کو "اجرامِ فلکی" کہتے ہیں۔ بچو حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب کسی سہارے اور ستون کے بغیر معلق ہیں۔ اور ان کی کوئی بنیاد (FOUNDATION) بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ نے یہ سب کچھ بنایا اور پھر ہماری زمین (دنیا) پھیلا دی گئی اور اس پر پہاڑ کھڑے کر دیئے گئے۔ (۱۳/۲۴، ۳۰/۸، ۳۱/۱۰، ۳۱/۲۹، ۳۵/۱۳، ۲۹/۵) پھر صرف ہماری دنیا میں ہی نہیں بلکہ دوسری مختلف دنیاؤں میں بھی

جن کا ہمیں ابھی تک علم نہیں ہو سکا، ارض و سموٰت میں ذی حیات (جاندار) پیدا کئے۔ (۴۲/۲۹) یہ سب بامقصد پیدا کئے گئے اور انسان کو بھی بلا مقصد یونہی پیدا نہیں کیا گیا۔ (۲۳/۱۱۵) بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس پروگرام اور مقصد کے تحت کائنات بنائی ہے کہا گیا کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انسان اللہ کی مدد کرے۔ (۲۶/۷) اور وہ اس طرح کہ اس کائنات کو مسخر کرے۔ یعنی یہ جتنے بھی کرّے اور سیارے جس میں ہماری دنیا بھی شامل ہے ان سب کو اپنا فرماں بردار اور محکوم و مغلوب بنائے لیکن بھئی یہ کائنات تو بہت بڑی، بہت ہی بڑی ہے اور انسان بہت چھوٹا اور کمزور ہے۔ یہ کام وہ کیسے کرسکتا تھا، لہٰذا، اللہ تعالیٰ نے انسان کو اتنی قوّتوں اور صلاحیتوں سے نوازا جس کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا اور اس کے ساتھ ہی کائنات کی ہر شے کو انسان کے مسخر کردیا (۱۵/۲۰) اور بتادیا کہ جو لوگ اور جو قوم اس کائنات میں غور و فکر کریں گے اور اللہ کے قانون کے مطابق اسے زیر کرنے کی کوشش کریں گے یہ سب چیزیں ان کے سامنے جھک جائیں گی۔ لہٰذا نظامِ فطرت پر غور کیا کرو۔ (۱۰/۱۰۱) اور اس پر بھی غور کیا کرو کہ کس طرح یہ سب کچھ ہوا کرتا ہے۔ (۲۹/۱۹-۲۰)۔

پیارے بچو! قرآنِ کریم کوئی سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ اس لئے اس میں فطرت کے قوانین کی کوئی فہرست نہیں دی گئی البتہ ایک بات واضح طور پر سمجھا دی کہ اس کائنات اور نظام میں کوئی جھول اور سقم نہیں ہے۔ (۶۷/۳-۴) اور ارض و سما کی ہر شے اللہ کے قانون اور قاعدے کے مطابق اپنا اپنا کام کررہی ہے۔ (۱۳/۱۵، ۲۲/۱۸، ۵۵/۶) اور انسان کے لئے اللہ کی اطاعت اسی وقت مکمل ہوتی ہے جب وہ فطرت کی قوّتوں کو مسخر کرکے انھیں قرآن میں بیان کردہ قوانین کے مطابق استعمال کرے۔ ایسا کرنے سے انسان کی دنیا بھی سنور سکتی ہے اور اس کا دائمی مستقبل

(آخرت) بھی شاندار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اسلام نام ہے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انھیں قرآنِ کریم کی مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنے کا اور تمام بنی نوع انسان کے مشترکہ فائدہ کے لئے استعمال میں لانے کا ــــ اور آخرت کی بات اس لئے کہی کہ اللہ تعالےٰ نے صاف صاف بتا دیا کہ "دیکھو" یہ دنیا انسان کی عارضی قیام گاہ ہے اس کے بعد انسان دوسری دنیا کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ (۲/۳۲، ۶/۹۹، ۱۱/۶، ۷/۲۴) ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتا دیا کہ جس طرح کائنات کی تمام قوتیں اللہ کے قانون کی اطاعت کر رہی ہیں اور اسی وجہ سے امن میں ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف، کوئی فساد اور کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر تم بھی اللہ کے قانون (قرآنِ کریم) کی اطاعت کرو گے تو ہمیشہ امن اور سلامتی میں رہو گے اور تمہارے لئے یہی دنیا جنّت کی مثال بن جائے گی۔ امن کا گہوارہ ہو جائے گی۔

(قاسم نوری)

طلوعِ اسلام خود پڑھیئے ۔ دوسروں کو پیش کیجئے !!

ہو سکتا ہے

- غور و فکر کرنے والے انسان ہمارے ہمنوا بن جائیں
- ناواقف اس کے متعلّق سوچنا شروع کر دیں

اور

- مخالفین پر ایک بار پھر ظاہر ہو جائے کہ طلوعِ اسلام زندہ ہے